Sharjeel Ahmed
شرجیل
تعلیم و تربیت
دسمبر 1998ء

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا

58 واں سال
نواں شمارہ

خوش خبری

نئے سال (جنوری 1999ء) سے آپ کے پسندیدہ ادیب محترم سعید لخت کی ننھے منے بچوں کے لیے پیاری پیاری کہانیوں کا آغاز..... جنہیں پڑھ کر نہ صرف آپ لطف اندوز ہوں گے بلکہ اپنے ننھے منے بہن بھائیوں کو سنائیں گے تو وہ بھی خوش ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

Sharjeel Ahmed

السلام علیکم ورحمتہ اللہ!

اس مہینے کی 25 تاریخ کو آج سے 122 سال پہلے (1876ء کو) ہمارے پیارے قائد محمد علی جناحؒ پیدا ہوئے اور پھر ان کی ان تھک کوششوں سے ہمیں یہ پیارا پاکستان ملا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس ملک کی قدر کریں۔ اسے امن کا گہوارہ بنائیں اور اسلام کا قلعہ بنانے کے لیے خوب محنت کریں۔ اسی مہینے کی آخری تاریخوں میں رمضان المبارک بھی شروع ہو رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ نیکیوں کے اس موسم بہار میں خوب نیکیاں سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔

سردی کا آغاز ہو گیا ہے۔ کوٹ، سویٹر، مفلر اور دیگر گرم کپڑے سردی سے بچاؤ کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں۔ آپ بھی سردی میں باہر نکلتے وقت اپنے آپ کو گرم کپڑوں سے لپیٹ لیں ورنہ سردی آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔

اور ہاں ایک بات اور ----- کیا خیال ہے، نئے سال سے یعنی اگلے مہینے (جنوری 1999ء) سے ایک اچھا سا دلچسپ جاسوسی ناول بھی شروع نہ کر دیا جائے؟ اس سلسلے میں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔ اڈیٹر

دسمبر
1998ء

سرورق: برفانی انسان

پرنٹر: عبدالسلام
مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم لاہور

قیمت فی پرچہ =/15 روپے
(رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی)

اس شمارے میں

سالانہ قیمت { پاکستان میں (صرف رجسٹری کے ساتھ) =/345 روپے
مشرق وسطیٰ افریقہ (ہوائی ڈاک سے) =/690 روپے
یورپ (ہوائی ڈاک سے) =/770 روپے
امریکہ مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) =/890 روپے

پتا: ماہنامہ تعلیم و تربیت 32 شارع بن بادیس، لاہور
فون: 6278815-6278816-6361309-6361310

رمضان کا مہینا

پھر آگیا ہے بچو! رمضان کا مہینہ
ہم کو سکھا رہا ہے نیکی کا یہ قرینہ

○○○

بہتر یہی ہے بچو! سحری کے وقت جاگو
ہر پل کرو عبادت اور پورے روزے رکھو

○○○

آتا ہے سال میں بس اک بار یہ مہینہ
اچھائیوں سے کرتا ہے پیار یہ مہینہ

○○○

یہ ماہ محترم ہے کہتا ہے سارا عالم
تم بھی کما لو نیکی، ہے نیکیوں کا موسم

○○○

اچھے وہی ہیں بچے، کرتے ہیں جو عبادت
دونوں جہاں کی ضیغم ملتی ہے ان کو راحت

ضیغم حمیدی

ڈاکٹر رضوان ثاقب

سڈول جسم، گورا چٹا رنگ اور گھنگریالے بالوں والا وہ سپاہی جان نثاری کے جذبے میں تو کسی سے کم نہیں تھا لیکن اسے جنگ کے میدان میں جانے کی اجازت فوج کا جرنیل اس لیے نہیں دے رہا تھا کہ وہ معذور ہو گیا تھا۔ پاؤں کی شدید چوٹ کے بعد اب اس نے لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔

آج اس عظیم جرنیل کی قیادت میں دشمن کے ساتھ پہلی لڑائی لڑی جا رہی تھی۔ فوج کو ترتیب دیا جا رہا تھا۔ جنگ کا سامان اکٹھا کیا جا رہا تھا۔ اس سے کم طاقت اور اس سے کم عمر کے لوگ آکر میدان جنگ میں جانے کی خواہش کر رہے تھے اور جرنیل ان کو بخوشی اجازت دیتے ہوئے ان کے نام درج کر رہا تھا۔ دشمن کے مقابلے میں اس جرنیل کے پاس فوج بھی بہت کم تھی اور سامان حرب و ضرب بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لیے دشمن کا سامنا کرنے کے لیے کہیں سے تنکا بھر مدد بھی مل جاتی تو جرنیل اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ مگر اس لنگڑے کو باوجود اصرار کے جنگ میں شریک ہونے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔

"کیا میری حیثیت ان ننھے بچوں کی سی بھی نہیں، کیا میں ان چوپایوں سے بھی حقیر تر ہوں جنہیں میدان جنگ میں جانے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے۔ کیا یہ لوہا جسے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے وہ آج مجھ سے بازی لے جائے گا۔ کاش مجھ میں لنگڑا پن نہ ہوتا"۔

وہ دل میں طرح طرح کے خیالات سوچتا ہوا آگے بڑھا اور اس عظیم جرنیل سے ایک بار پھر جنگ میں شریک ہونے کی اجازت چاہی اور کہا کہ میں لنگڑا ضرور ہوں مگر مجھے امید ہے کہ میں کسی معرکے میں کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا۔ دوڑ کر جھپٹوں گا، بہادری سے لڑوں گا، غرض اجازت چاہنے کے لیے اس نے طرح طرح سے جرنیل کو یقین دلانے کی کوشش کی مگر جرنیل کی طرف سے ایک ہی جواب تھا کہ تمہارے پاؤں پر چوٹ آگئی ہے اور تم لنگڑا کر چلتے ہو۔ یوں اس عظیم جرنیل کی قیادت میں یہ جنگ بھی فتح و کامرانی کے ساتھ گزر گئی۔ مگر اسے شدید خواہش کے باوجود اس میں شریک ہونے کا موقع نہ مل سکا۔

اس جنگ کو جیتے ہوئے ایک سال ہونے کو تھا لیکن دشمن اپنی شکست بھلا ٹھنڈے پیٹوں کیسے برداشت کرتا، دشمن فوج نے تو اسی روز سے اس ہار کا بدلہ لینے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں اور طرح طرح کی سازشیں کر رہے تھے۔ اسی بنا پر تقریباً ایک سال کے بعد جرنیل نے دوبارہ اعلان جنگ کیا۔

اس لنگڑے سپاہی نے ایک بار پھر میدان جنگ میں پہنچنے کے لیے اجازت مانگنا چاہی۔ کیوں کہ وہ اس موقع کے

لیے ایک ایک دن بڑی بے تابی سے گزار رہا تھا۔ اور آج وہ دن آن پہنچا تھا جب اسے میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگنے کا دوبارہ موقع مل رہا تھا۔ وہ اب اس موقع کو کسی صورت بھی ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا تھا۔ جنگ کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ فاتح جرنیل شہر کے باہر ایک چھوٹی سی بستی کے قریب بیٹھا ہوا تھا اور یکے بعد دیگرے نوجوان لڑائی پر جانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہے تھے۔ کئی کڑیل جوان اپنا نام درج کروا کر جنگ کے لیے اپنے آپ کو مسلح کر رہے تھے۔ کیسا روح پرور منظر تھا۔

اسی اثنا میں بستی کی طرف سے ایک شخص لنگڑاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی جس کے سہارے وہ چل رہا تھا۔ اس کا چہرہ فرط جوش سے تمتما رہا تھا۔ میدان جنگ میں پہنچنے اور جنگ میں عملی طور پر حصہ لینے کی وہ آج ہر صورت اجازت لینا چاہتا تھا۔ ابھی وہ ان لوگوں سے چند قدم دور ہی تھا کہ اس نے چلا کر کہا "میں بھی حصہ لوں گا"۔

عجیب منظر تھا لنگڑی ٹانگ والا وہ شخص لڑائی میں شریک ہونے کا شدت سے اصرار کر رہا تھا اور وہاں پر موجود سب لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ "تم تو معذور ہو، تمہارا اس جنگ میں شریک ہونا ضروری نہیں"۔

پھر جب اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا تو اسی ہی کی بستی کا ایک معتبر شخص اٹھا اور اسے سمجھانے لگا "دیکھو بھائی! تمہارے گھر سے یہ چار جوان اس جنگ میں شامل ہو رہے ہیں، تم خوش نصیب ہو کہ تمہارا سارا گھرانہ دشمن کے خلاف اس مقدس لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔ اس سے زیادہ تم پر کوئی بوجھ نہیں اور نہ ہی کوئی تم سے شریک نہ ہونے پر پوچھ گچھ کرے گا"۔

اس شخص نے ان سب کی باتوں کو سنا تو تھا مگر اسے میدان جنگ سے روکنے والے ہر شخص کی بات ایسے لگ رہی تھی جیسے اس کے کلیجے پر چھری چل رہی ہو۔ پھر جب اسی کے چند رشتہ داروں نے اسے جنگ میں شریک نہ ہونے کا مشورہ دیا تو وہ بھڑک اٹھا اور کہنے لگا "تم چپ رہو..... تم نے مجھے پچھلے سال بھی جانے سے روک دیا تھا۔ کیا جہاد کا سارا ثواب تم ہی لینا چاہتے ہو، کیا میں اس کا حق دار نہیں؟ یہ کیسی عجیب بات ہو گی کہ تم تو جنت کے مزے لوٹو اور..... اور میں یونہی لنگڑاتا رہ جاؤں"۔

اس کی یہ بات سن کر پوری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ جذبوں سے سرشار جنگ کے لیے تیار قافلہ ایسے خاموش ہو گیا تھا جیسے ان کے قریب ہی سے دشمن کا قافلہ گزر رہا ہو۔ لنگڑے پن کے باوجود سرشاری کا یہ جذبہ دیکھ کر سب ہی تو دنگ تھے۔ پھر محفل میں موجود ایک معمر شخص آگے بڑھا اور اس کا بازو تھام کر کہنے لگا۔

"بھائی! مانا کہ تم یہ سب کچھ ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن تم ذرا یہ تو بتاؤ کہ وہاں جاؤ گے کیسے؟"

وہ معذور جو چلنے سے عاری تھا، بغیر کسی تامل کے پر عزم انداز میں بولا "خدا کی قسم میں گھسٹتا ہوا پہنچ جاؤں گا"

پھر وہ قریب ہی کھڑے اپنے ایک دوست کے سینے پر ہاتھ مار کر پر جوش انداز میں کہنے لگا۔ "ہاں..... تم سب دیکھ لینا کہ میں اپنی لنگڑی ٹانگ کے ساتھ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہوں گا"

پھر وہ جرنیل کی طرف پروقار انداز میں بڑھا۔ اس نے چلتے ہوئے حتی المقدور کوشش کی کہ اس کا لنگڑا پن ظاہر نہ ہونے پائے۔ اور یہ ظاہر ہو کہ وہ اس معذوری کے باجود چل سکتا ہے۔ مگر شومئی قسمت دیکھئے کہ وہ اس کوشش اور احتیاط کی وجہ سے اور زیادہ لڑکھڑانے لگا۔ جنگ کی تیاریوں کو حتمی شکل دی جا رہی تھی اور اس معذور شخص نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو ایک ہاتھ سے دبا کر سپہ سالار سے بڑے ہی عاجزانہ انداز میں آخری بار عرض کیا۔

"اے میرے محبوب راہ نما! میری آرزو ہے کہ میں اپنے لنگڑے پاؤں سے جنت میں چہل قدمی کروں"۔

عظیم سپہ سالار، فاتح جرنیل اس شخص کی جذبوں بھری التجا سن کر سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف فوراً متوجہ ہوا اور اسے تسلی دیتے ہوئے فرمایا۔

"اے (جذبوں سے سرشار) شخص! اللہ نے معذور کیا تو نہ جانے اس میں کیا حکمت ہے"۔

اس معذور شخص نے اپنی نظریں جھکا لیں اور اپنے اس عذر پر اپنے آپ کو بڑا ہی بے بس سمجھنے لگا۔ اب وہ اپنی لنگڑی ٹانگ کو بری طرح دبا رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے اپنا سارا غصہ اسی ٹانگ پر اتارے گا۔ لیکن ایسا کرنے سے بھلا اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا، ٹانگ کو دبانے سے نہ تو اس کی ٹانگ صحیح ہو جانی تھی اور نہ اس طرح اس نے خودبخود میدان جنگ تک پہنچ جانا تھا۔ لہذا اس نے اس بے مقصد کوشش کو فوراً ترک کیا اور جھک کر آگے ہاتھ بڑھایا اور جرنیل کے دامن کو پکڑ لیا۔ اب اس شخص کی زبان سے کوئی عرض، کوئی التجا نہیں نکل رہی تھی بلکہ وہ تو سب کچھ آنسوؤں کی زبان میں بیان کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل جاری آنسو اس کے ذوق جہاد اور شوق شہادت کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی لنگڑی ٹانگ فرش پر پڑی پھڑک رہی تھی۔ جرنیل نے جب اس کی اس بے قراری اور بے تابی کو دیکھا تو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرمایا۔

"جاؤ تیاری کرو، تمہاری آرزو پوری ہوئی، تمہیں میدان جنگ میں جانے اور جہاد میں شریک ہونے کی اجازت ہے"۔

اس لنگڑے شخص نے جب جرنیل کے منہ سے یہ الفاظ سنے تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا۔ وہ اپنی لاٹھی پر تیز تیز چلتا ہوا اپنی بستی میں واپس آیا اور دور ہی سے چیخ چیخ کر پکارنے لگا۔

"میرا بھالا چھت سے نکال کر جلدی سے صاف کرو، مجھے اجازت مل گئی ہے۔ میرے محبوب جرنیل نے مجھ لنگڑے کو جہاد کرنے کی اجازت دے دی ہے"۔

پھر اگلی صبح کا سورج طلوع ہوا۔ جرنیل کی قیادت میں فوج میدان جنگ کی طرف جانے کو تیار ہوئی تو فوج کے سپاہیوں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ایک گھر سے چار کڑیل

جوان ہر طرح سے مسلح ہو کر نکل رہے تھے۔ ان کے پیچھے پانچواں سپاہی بھی لنگڑاتا ہوا باہر آرہا تھا لیکن آج اس کے ہاتھ میں لاٹھی کے بجائے لمبا سا نیزہ تھا جس کا پھل صبح کے سورج کی تیز کرنوں سے چمک رہا تھا۔ لیکن فوج نے دیکھا کہ اس نیزے کی چمک سے کہیں زیادہ چمک خود اس کے اپنے چہرے پر تھی۔ کسی نے اسے لنگڑاتے ہوئے میدان جہاد میں جاتے دیکھا تو پیچھے سے کہا۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ جنگ سے بھاگ کر واپس گھر لوٹ آئے گا"۔

لنگڑا سپاہی یہ بات سن کر بگڑ گیا اور کعبہ کی طرف منہ کر کے کہنے لگا۔

"اے اللہ! مجھے میرے گھر کی طرف لوٹا کر نہ لانا"۔

آخرکار وہ لنگڑا سپاہی میدان جنگ میں پہنچ گیا۔ بڑی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ ایک شخص دور ایک اونچی جگہ پر کھڑا ہو کر جنگ کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک لنگڑا سپاہی اپنے نیزے کو ٹیکتے ہوئے بڑی آن سے نعرہ لگاتا ہوا دشمن کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی ٹانگ بری طرح لڑکھڑا رہی ہے۔ لیکن وہ اپنی ٹانگ کی پروا کئے بغیر ایسی تیزی سے آگے بڑھتا کہ اس کے ساتھ چلنے والوں کو دوڑ کر ساتھ ملنا پڑتا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر خدا کے ایک دشمن کے سینے میں اپنا نیزہ گھونپ دیا اور اس کے ساتھ ہی نعرہ لگایا "خدا کی قسم! میں جنت کا مشتاق ہوں"۔

اسی طرح جواں مردی سے لڑتے ہوئے اپنی معذوری کے باوجود ان لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے جن کے سب اعضاء صحیح و ثابت تھے آخرکار وہ شہادت کے عظیم مرتبے پر فائز ہو گیا۔ جنگ ختم ہوئی اس کی لاش ایک اونٹ پر ڈال کر اس کے گھر لے جانے کی کوشش کی گئی۔ مگر اونٹ تھا کہ چند قدم چل کر بیٹھ جاتا تھا۔ اسے مار پیٹ کر اٹھایا جاتا مگر وہ کسی طور پر اس سپاہی کے گھر کا رخ نہ کرتا۔ بلکہ واپس میدان جنگ ہی کی طرف دوڑتا۔

اس بات کا علم اس فوج کے جرنیل کو ہوا۔ جرنیل بڑی سمجھ بوجھ رکھتا تھا۔ اس نے اس معذور سپاہی کے گھر والوں سے پوچھا کہ گھر سے نکلتے ہوئے اس نے کیا کہا تھا۔ بتایا گیا کہ اس نے قبلہ کی طرف رخ کر کے کہا تھا "اے اللہ! مجھے میرے گھر کی طرف لوٹا کر نہ لانا"۔

جرنیل نے کہا "اس (خوش نصیب) کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ اسی لیے اونٹ اس کے گھر کی طرف قدم نہیں بڑھاتا"۔ چنانچہ اس لنگڑے شہید کو وہیں لٹا دیا گیا۔

کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ خوش نصیب لنگڑا کون تھا؟
یہ رسول ﷺ کے جان نثار صحابی حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے قبیلہ خزرج کے خاندان سلمہ کے رئیس تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد غزوۂ بدر میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی مگر رسول ﷺ نے ان کو ایک ٹانگ سے معذور ہونے کی وجہ سے اجازت نہ دی۔ پھر غزوہ احد میں جب انہیں جہاد میں شریک ہونے کی اجازت ملی تو بڑی ہی جواں مردی سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ آپؓ کا رنگ گورا اور بال گھنگھریالے تھے۔ آپؓ بڑے فیاض تھے۔ اسی فیاضی کی وجہ سے حضور ﷺ نے انہیں بنو سلمہ کا سردار بنایا تھا۔

آپؓ کی شہادت کے بعد سب سے بڑے جرنیل اور عظیم سپہ سالار رسول ﷺ شام کو احد کے شہیدوں کے معائنہ کے لیے میدان میں تشریف لائے۔ جب حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے تو آپ رضی اللہ عنہ کے جسد مبارک کو دیکھ کر فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کی دعا قبول فرماتا ہے۔ عمرو رضی اللہ عنہ بھی انہیں میں سے ہیں۔ میں انہیں جنت میں اسی لنگڑے پاؤں سے چلتے ہوئے دیکھ رہا ہوں"۔

کتنے خوش نصیب تھے حضرت عمرو رضی اللہ عنہ جو لنگڑے ہونے کے باوجود اپنے شوق اور جذبے کی بنیاد پر رسول ﷺ سے جنت کی ضمانت لے کر رخصت ہوئے۔ کاش ہم سب میں بھی ایسا ہی جذبہ جہاد پیدا ہو جائے (آمین)

قندیل

نجمہ معراج

فاضل خاں اور فرح کو شادی کے چار سال بعد خدا نے ایک بچی دی۔ پوتی کا نام اس کی دادی اماں نے قندیل رکھا۔ فاضل اور فرح اپنی بچی سے بہت لاڈ پیار کرتے تھے۔ فاضل خاں کا ایک چھوٹا سا مچھلی فارم تھا اور ایک مرغی خانہ۔ اس نے مچھلی فارم اور مرغی خانے کے ساتھ ہی ایک خوب صورت باغ بھی بنایا ہوا تھا۔ قندیل اب اللہ کے فضل سے تین سال کی ہو گئی تھی۔ فاضل صاحب جب بھی اپنے کام کے لیے فارم پر جاتے تو قندیل ساتھ جانے کے لیے کہتی۔

ہلکی پھلکی چست اور ہونہار قندیل جو بجلی کی گڑیا لگتی تھی' روزانہ باپ کے ساتھ باغ میں جاتی اور خوب سیر کرتی۔ اس کی دادی بھی اس سے بہت پیار کرتی تھی۔ اس کی روشن آنکھیں' کھلکھلاتے چہرے اور صاف ستھری عادات کی وجہ سے گاؤں کے سب لوگ ہی اسے پیار بھری نظروں سے دیکھتے تھے۔

فاضل صاحب تو باپ دادا کے وقتوں سے اسی گاؤں میں رہ رہے تھے۔ البتہ فرح یہاں شہر سے بیاہی آئی تھی۔

فاضل صاحب کو تو ابھی بچی کی پڑھائی کی کوئی فکر نہ تھی۔ کیوں کہ گاؤں کے گورنمنٹ اسکول میں پانچ سال سے پہلے بچے کو داخل نہیں کرتے ہیں۔ فاضل صاحب خود بھی تو پانچ برس کے ہو کر اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ جب کہ فرح شہر میں پڑھی تھی۔ وہاں تو اڑھائی تین سال کے بچے کو بھی اسکول داخل کروا دیا جاتا ہے۔

فرح نے سوچا کہ قندیل کو اسکول بھیجنا چاہیے' یہ تو اب کافی بڑی ہو گئی ہے۔ فرح نے فاضل صاحب سے بات کی تو انہوں نے ہنس کر کہ دیا کہ بیگم ابھی بچی بہت چھوٹی ہے' اسے کھیلنے کودنے دو۔ پانچ سال کی ہو گی تو اسکول بھیج دیں گے۔ اب تو اسے اسکول میں داخلہ بھی نہیں ملے گا۔ فرح یہ بات سن کر بہت پریشان ہوئی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ قندیل کو جلد از جلد اسکول بھیجا جائے۔

اگلی ہی صبح فرح کا بھائی شہر سے فرح کو ملنے کے لیے گاؤں آیا۔ اس نے قندیل کی امی کا چہرہ کچھ پریشان دیکھا تو بہن سے پریشانی کی وجہ پوچھی۔ فرح نے بتایا کہ وہ قندیل کی پڑھائی کے متعلق پریشان ہے۔ خان صاحب اسے پانچ برس سے پہلے اسکول کا منہ تک دکھانے کو رضامند نہیں اور میں اسے آج ہی اسکول بھیجنا چاہتی ہوں۔

فرح چاہ رہی تھی کہ وہ بچی کی تعلیم کے لیے شہر منتقل ہو جائیں۔ لیکن فاضل خاں نے کہا "یہ میرا کاروبار اور میری بوڑھی ماں کہاں جائیں گے؟ میں شہر نہیں جا سکتا۔ قندیل ادھر گاؤں کے اسکول میں ہی پڑھے گی"۔

اس بات پر ان کی تھوڑی سی ناراضگی بھی ہو گئی

تھی۔ جس کی وجہ سے فرح بہت پریشان تھی۔ فرح کی ساری باتیں سن کر اس کے بھائی نے کہا "قندیل کو میرے پاس بھیج دو۔ یہ وہاں نادیہ کے ساتھ ہی اسکول چلی جایا کرے گی۔ نادیہ کو بھی تو ابھی دو ماہ ہی ہوئے ہیں اسکول داخل ہوئے۔ دونوں کی ایک دوسرے کے ساتھ دوستی بھی خوب رہے گی"۔

بڑی مشکل سے بہن اور بھائی نے مل کر فاضل صاحب کو رضا مند کیا اور قندیل شہر کے اسکول میں پڑھنے کے لیے اپنے ماموں کے ساتھ ان کے ہاں چلی گئی۔ وہ بچوں خاص کر نادیہ سے جلد ہی مانوس ہو گئی۔ کیوں کہ وہ دونوں تقریباً ہم عمر بھی تھیں اور ہم جماعت بھی۔

قندیل کے ماموں کا گھر شہر کے گنجان آباد علاقے میں تھا۔ تین مرلے پر بنا ہوا یہ مکان انہوں نے چار سال پہلے خریدا تھا۔ ایک سال قبل انہوں نے ایک نئی کالونی میں دس مرلے کا پلاٹ لیا تھا۔ جس پر پیسے نہ ہونے کی وجہ سے مکان کی تعمیر کا کام شروع نہ کر سکے تھے۔

گاہے بگاہے قندیل اپنے والدین سے ملنے گاؤں بھی چلی جاتی اور کبھی اس کی امی اسے ملنے کے لیے اپنے میکے آجاتیں۔ اس سب کچھ کے باوجود قندیل جو شوخ، چست اور ہر وقت باتیں کرنے والی بچی تھی اب خاموش اور چڑچڑی سی ہو گئی تھی۔ لیکن قندیل کی والدہ کے سر پر یہ جنون سوار تھا کہ وہ چھوٹی عمر میں بڑی جماعتوں میں پہنچ جائے۔ لہٰذا وہ ایسی باتوں کو نظر انداز کر دیتی۔ حال آں کہ قندیل اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ وہ اس کے گاؤں سے جانے کے بعد تنہا سے ہو کر رہ گئے تھے۔ قندیل کو اسکول داخل ہوئے چھ ماہ گزر گئے۔ اس چھ ماہ کے عرصے میں قندیل کی ٹیچر نے کئی دفعہ اس کے ماموں کو پیغام بھیجا کہ یہ بچی پڑھائی میں پوری توجہ نہیں دیتی اور ہر وقت کلاس میں الجھے ہوئے بالوں کے ساتھ کھوئی کھوئی اور اداس سی بیٹھی رہتی ہے۔

اول تو قندیل اب کلاس میں سارا دن خاموش ہی بیٹھی رہتی اور اگر کسی سے کوئی بات کرتی بھی تو اپنے ماں باپ، دادی اور باغ کی باتیں کرتی اور جو لڑکی اس کی یہ باتیں نہ سنتی اس سے ناراض ہو جاتی۔ وہ اکثر ہی ان سے کہتی "ادھر تو کوئی درخت بھی نہیں ہے"۔

ایک دن ماموں نے قندیل سے پوچھا "بیٹا، تم ہر وقت اداس کیوں بیٹھی رہتی ہو۔ کھیلا کودا کرو۔ کہیں اپنے امی ابو سے تو اداس نہیں ہو جاتی"۔

قندیل اپنی باریک سی آواز میں بولی "نہیں ماموں جی، میں امی ابو سے اداس تو نہیں ہوتی لیکن اپنے دوستوں سے اداس ہو جاتی ہوں"۔

ماموں، قندیل کی یہ بات سن کر ہنسنے لگے اور کہنے لگے "بیٹا کون ہیں دوست آپ کے؟ کبھی ہمیں بھی تو ان سے ملواؤ"۔

قندیل فوراً بولی "ماموں جی، وہ ادھر نہیں آسکتے"۔

"وہ یہاں نہیں آسکتے؟" ماموں نے قندیل کی یہ بات سن کر قہقہہ لگایا اور اسے پکڑ کر ساتھ لگا لیا۔ پھر پیار کرتے ہوئے بولے "بیٹا! اس کا بھی کوئی حل نکال لیں گے۔ آپ انہیں آنے کی دعوت تو دیں"

مگر اس کے جواب میں قندیل نے کچھ نہ کہا بلکہ اس کے چہرے سے مزید مایوسی اور اداسی ظاہر ہونے لگی۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا اور اب اس کا ذہن کچھ بڑا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے گھر والے کھلے ماحول، کھیتوں اور باغات کو کبھی فراموش نہ کر سکی۔ وہ صبح سویرے درختوں کے پتوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی اور جھومتی شاخوں سے آنے والی تازہ اور صاف ہوا کو ہمیشہ ترستی رہتی۔ وہ اسکول سے واپس آکر تھوڑا بہت کھانا کھاتی اور اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ وہاں پر رنگوں سے کاغذوں پر مختلف قسم کے درختوں اور ان پر بیٹھے ہوئے پرندوں کی تصویریں بناتی رہتی۔ کبھی درختوں کی اوٹ سے نکلنے والے سورج کا منظر بناتی تو کبھی سرسوں اور گنے کے کھیتوں کی تصویریں بناتی۔ اب وہ روزانہ کلاس میں ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے مار بھی کھانے لگی تھی۔

آج اسمبلی کے بعد جب سب استانیاں اپنی اپنی کلاسوں میں گئیں تو انہوں نے سب سے پہلے بچوں کو یہ خوش خبری سنائی کہ وہ کل بسوں میں بیٹھ کر سیر کے لیے مشہور مصنوعی جنگل چھانگا مانگا جائیں گے اور وہاں بہت سارے درخت دیکھیں گے۔ اس لیے کل سب بچیاں اپنے بستوں کے بغیر اسکول آئیں۔

"کیا درخت دیکھنے کے لیے بھی بسوں پر جانا پڑتا ہے؟ کیا شہر میں درخت لگانا منع ہے؟ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ شہر والوں نے خود تو کئی کئی منزلہ عمارتیں بنالی ہیں جب کہ بے چارے درختوں کو یہاں زمین پر رہنے کی اجازت بھی نہیں اور انہیں شہر سے ہی نکال دیا گیا ہے۔ آخر ان کا کیا قصور؟ وہ تو کسی کو بھی تنگ نہیں کرتے۔ ہمیشہ انسانوں کے کام آتے ہیں۔ کبھی بھی انہوں نے کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچایا"

اپنی کلاس کی مس کی بات سن کر قندیل انہی سوچوں میں گم ہو گئی تھی اور یہی سوچتے سوچتے ڈیسک سے دھڑام کی آواز کے ساتھ نیچے گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ کلاس ٹیچر فوراً اٹھا کر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ کلاس کی ساری بچیاں انتہائی پریشان دکھائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے فوری طبی امداد دی جس سے قندیل ہوش میں آگئی۔ ہیڈ مسٹریس نے ڈاکٹر سے کہا کہ بچی کو اچھی طرح چیک کریں اور براہ کرم ہمیں بتائیں کہ یہ بے ہوش کیوں ہوئی۔

ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد کہا کہ بچی بظاہر تو بالکل ٹھیک ٹھاک ہے، اس کی نبض بھی صحیح چل رہی ہے۔ بخار بھی نہیں، کیوں کہ جسم کا درجہ حرارت بالکل صحیح ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقتی طور پر کوئی شدید ذہنی صدمہ پہنچا ہو جس سے ایسا ہو گیا ہو۔

پھر قندیل کو چھٹی ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچا دیا گیا۔ اس کے ماموں نے جب سارا واقعہ سنا تو وہ اسے چیک اپ کے لیے چائلڈ اسپیشلسٹ (بچوں کے ماہر ڈاکٹر) کے پاس لے گئے۔ اس نے قندیل کا مکمل معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ یہ بچی اپنے والدین سے دور ہے، اس وجہ سے یہ شدید نفسیاتی دباؤ کا شکار ہے۔ اس پر قندیل کے ماموں نے کہا "ڈاکٹر صاحب، ہم اس سے والدین سے بڑھ کر پیار کرتے ہیں اور پھر یہ والدین کا کبھی نام بھی تو نہیں لیتی۔ اسے تو تین سال گزر گئے ہیں ادھر ہمارے ہاں رہتے ہوئے مگر ہمیں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔ بہرحال اگر آپ چاہتے ہیں تو اس

کو کوئی ذہنی سکون کی دوائی دے دیں"۔

ڈاکٹر نے کہا "ابھی تو بچی کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اس کو چھ ماہ تک کوئی دوائی نہ دیں۔ اس کی آنکھوں کی کیفیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی چیز کے چھن جانے کا شدید دکھ ہے۔ ویسے بھی یہ بات ظاہر ہے کہ یہ بچی والدین سے دور ہے۔ آپ اس کو کم از کم چھ ماہ کے لیے اس کے والدین کے پاس رکھیں اور پھر اگر نارمل نہ ہو تو میرے پاس دوبارہ چیک اپ کے لیے لائیں۔ لیکن آپ فکر نہ کریں مجھے سو فی صد امید ہے کہ یہ والدین کے پاس جا کر تن درست ہو جائے گی"۔

ماموں نے ڈاکٹر کی اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ بچی گاؤں کے اسکول میں پڑھے۔

دن یونہی گزرتے رہے۔ اب بہار کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ قندیل اب اور بھی افسردہ رہنے لگی تھی۔ ایک دن وہ نیند میں بڑبڑانے لگی "میرے پیارے دوستو' کیا ہوا جو تم چل نہیں سکتے' میں بس جلد ہی تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔ میرے پیارے دوستو! سرسبز درختو! بس تھوڑی دیر اور میرا انتظار کرو"۔

قندیل دراصل درختوں سے بہت محبت کرتی تھی اور شہر میں آکر اسے ان کی شدید جدائی محسوس ہوتی تھی۔ اب اس کے ماموں بھی یہ بات سمجھ گئے تھے۔ انہوں نے اگلی صبح قندیل کو چند گملے لا کر دیئے اور کہا "بیٹا' تم ان کو پانی دیا کرو اور ان کی دیکھ بھال کیا کرو۔ ایک نہ ایک دن یہ بھی تمہارے دوستوں کی مانند بڑے بڑے قد آور درخت بن جائیں گے۔ پھر تم ان سے دوستی کر لینا"۔

قندیل بھولی بھالی اور سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ اسے کیا معلوم کہ مٹھی بھر گملے کی مٹی کبھی قد آور درخت کو خوراک مہیا نہیں کر سکتی۔ وہ تو بے چاری اس آس پر پودوں کو پانی دیتی رہی کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اس کے دوستوں کی طرح قد آور درخت بن جائیں گے۔

قندیل کو پودوں کو پانی دیتے ہوئے بہت عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ اب نرسری اور پریپ پاس کر کے پہلی جماعت میں ہو گئی تھی مگر گملوں کے پودے سرسبز و شاداب ہونے کے باوجود اتنے ہی سائز کے تھے جتنے سائز کے پہلے دن تھے۔ اسے اب ایسے لگنے لگا جیسے درخت اس سے روٹھ گئے ہیں۔ اور اس کے پانی دینے کے باوجود پھلتے پھولتے نہیں۔

وہ اب پہلے سے بھی زیادہ اداس رہنے لگی لیکن کسی سے اس کا ذکر نہ کرتی۔ مگر اسے خوابوں اور خیالوں میں بھی درخت نظر آنے لگے تھے۔

ایک رات سب لوگ صحن میں سونے کے لیے چارپائیاں بچھا رہے تھے۔ قندیل اور نادیہ کی چارپائیاں بھی نادیہ کی والدہ نے قریب قریب بچھا دیں۔ یوں وہ دونوں ایک دوسرے کے پاس پاس ہی لیٹ گئیں۔

قندیل جب بھی سونے کی کوشش کرتی تو اسے نیند آنے کے بجائے عجیب و غریب خیال آنے لگتے۔ وہ انتہائی بے چینی اور بے تابی کے عالم میں اپنی کزن کو اٹھاتی اور کہتی "نادیہ' یہاں سے چارپائی اٹھا کر ادھر کر لو۔ یہاں ایک درخت اگ رہا ہے"۔

تین چار دفعہ اس نے ایسے ہی کہا۔ نادیہ تنگ آکر اپنے والد کو بلا لائی اور کہنے لگی "ابو جی! قندیل کو پتا نہیں کیا ہو رہا ہے۔ میں جہاں بھی چارپائی بچھاؤں یہ بچھانے نہیں دیتی۔ اپنی چارپائی بھی اس نے کھڑی کر دی ہے اور کہتی ہے کہ یہاں درخت اگ رہے ہیں"۔

قندیل کے ماموں نے بڑے پیار کے ساتھ سمجھایا "بیٹا' یہاں ہم نے کوئی درخت لگایا ہی نہیں تو اگے گا کیسے؟ پھر وہ اسے لٹا کر تھپ تھپانے لگے جس سے اس نے آنکھیں تو بند کر لیں مگر اس کی ساری رات درختوں کے بارے میں سوچتے ہوئے گزر گئی۔ دن چڑھتے ہی ماموں نے قندیل کو دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ انہوں نے قندیل کو ساتھ لیا اور اس کے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ قندیل نے گھر پہنچ کر ماں

باپ کو سلام کیا' جوتے اتارے اور کچھ کھائے پئے بغیر اپنے باغ کی طرف دوڑ پڑی۔ وہ درختوں سے اس طرح لپٹ لپٹ کر مل رہی تھی جیسے کوئی بچہ ماں سے بچھڑ کر بہت دیر بعد ملا ہو۔ وہ ایک ایک درخت کے ساتھ لپٹتی' پتوں کو دیکھتی شاخوں اور کونپلوں پر نظر ڈالتی۔ اس کی آنکھیں خوشی کے جذبات سے چمک اٹھی تھیں۔ گاؤں کے لوگ سمجھنے لگے کہ قندیل پاگل ہو گئی ہے۔ لیکن چند دنوں بعد ہی قندیل کی تمام اداسی ختم ہو گئی' چہرہ ہشاش بشاش ہو گیا اور پھر اس میں وہ سب شوخیاں لوٹ آئیں جو ایک عرصہ سے اس سے روٹھی ہوئی تھیں۔ اب اس کو گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا گیا تھا اور وہ اپنے اسکول کی سب سے ہونہار اور لائق طالبہ ثابت ہوئی تھی۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد قندیل جب اپنی امی کے ساتھ اپنے ماموں کے گھر گئی تو ماموں نے ماہر نفسیات کو دوبارہ دکھانے کے لیے کہا مگر گھر کا کوئی فرد اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ مگر ماموں نے کہا کہ کہیں زندگی میں اسے دوبارہ ایسی مشکل پیش نہ آجائے لہٰذا ہمیں دوبارہ ضرور دکھانا چاہیے۔ ماہر نفسیات کو دکھایا گیا اور گاؤں میں قندیل کی ساری مصروفیات کے بارے میں بتایا گیا تو ماہر نفسیات نے کہا ''قندیل نہ پاگل ہے اور نہ ہی کبھی پاگل ہوئی تھی۔ بات دراصل یہ ہے کہ اسے درختوں سے والہانہ محبت ہے۔ وہ انہیں اپنا دوست سمجھتی ہے اور ان کی جدائی برداشت نہیں کر سکتی۔ چوں کہ اس شہر میں درخت نہ ہونے کے برابر ہیں لہٰذا اس نے اس کمی کا ذہن پر گہرا اثر لے لیا تھا''۔

ماہر نفسیات کی اس بات سے سب مطمئن ہو گئے۔ قندیل اب واپس گاؤں آگئی۔ ایک دن وہ مچھلی فارم کے پاس بیٹھی ہوئی تھی کہ اس کے والد بھی وہاں آگئے۔ پھر وہ اس سے باتیں کرنے لگے۔ وہ بڑے پیار سے بولے ''بیٹا قندیل' مجھے ایک بات تو بتاؤ کہ آپ درختوں سے کیوں اتنا پیار کرتی ہو؟''

''ابو جی یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں ان سے پیار کیوں کرتی ہوں لیکن اتنا میں جانتی ہوں کہ ان کے فائدے بہت ہیں۔ ہماری استانی راحت نے بتایا تھا کہ درخت ہوا کو صاف کرتے ہیں اور ہماری آنکھوں کو تازگی پہنچاتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ ایک درخت 32 بچوں کو آکسیجن مہیا کرتا ہے''۔

قندیل کی یہ بات سننے کے بعد فاضل خاں نے کہا ''بیٹا' اب تم ٹھیک ہو گئی ہو پھر ماموں کے پاس چلی جاؤ اور وہاں کے اسکول میں داخل ہو جاؤ۔ کیوں کہ آپ کی امی جان آپ کو شہر کے اسکول میں پڑھانا چاہتی ہیں''۔

قندیل یہ سن کر رونے لگی اور کہنے لگی ''ابو جی' میں اب شہر کے اسکول میں پڑھنے کے لیے نہیں جاؤں گی۔ وہاں میرے دوست' درخت نہیں ہیں اور یہ وہاں رہ بھی نہیں سکتے۔ کیوں کہ وہاں تو ہر جگہ اونچی اونچی عمارتیں ہیں۔ میں اسی گاؤں کے اسکول میں پڑھ کر شہر کے بچوں کے مقابلے میں زیادہ علم حاصل کروں گی''۔

اس کے والد کو قندیل کی یہ دلیل بہت اچھی لگی۔ لہٰذا انہوں نے فرح کو بھی سمجھایا کہ آئندہ قندیل کو شہر جانے کے لیے نہ کہے۔ فرح نے اپنی بیٹی کی خوشی کے لیے اسے گاؤں کے اسکول ہی میں پڑھتے رہنے کی اجازت دے دی۔ قندیل روزانہ صبح سویرے اٹھتی۔ دانت صاف کرتی' نہانے کے بعد نئے کپڑے پہنتی' اپنی امی کے ساتھ نماز پڑھتی اور ناشتہ کر کے اسکول چلی جاتی۔ وہ تیسری جماعت میں بہت اچھے نمبر لے کر پاس ہوئی۔ قندیل کا پتا کرنے اور اپنی بہن سے ملنے قندیل کے ماموں تقریباً تین ماہ بعد آئے۔ وہ قندیل کو دیکھتے ہی سوچنے لگے کہ اس کا مسئلہ نفسیاتی نہیں ماحولیاتی تھا۔ یہ اس ماحول' شہر کے دھویں اور گندی ہوا کو قبول نہیں کر پائی تھی۔ یہ کھلی فضا میں رہنا چاہتی تھی۔ جہاں ہر گھر میں دو چار درخت ہیں۔ پھر وہ سوچنے لگے کہ جب درخت لگانا عبادت بھی ہے اور ماحول کی آلودگی کے خاتمے کا موثر ترین ذریعہ بھی تو پھر ہم شہر والوں کو بھی چاہیے کہ اپنے گھروں اور محلوں میں خوب درخت لگائیں۔ اسی لمحے انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے دس مرلے کے خالی پلاٹ میں مکان کی تعمیر کے ساتھ ساتھ اس میں درخت بھی ضرور اگائیں گے تاکہ قندیل جب شہر آئے تو اسے اپنے دوستوں کی جدائی کا احساس نہ ہو۔

مدد صرف اللہ ہی سے مانگنی چاہیے

انسان کی ہر مشکل اور ہر مسئلے میں مدد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کر سکتے ہیں۔ اس اہم موضوع کی وضاحت کے لیے ہم نے بچوں کے لیے درس قرآن کے لیے پہلے پارہ کی پہلی سورہ کی چوتھی آیت کے یہ دو مبارک الفاظ چنے ہیں۔

اِیّاکَ نَسْتَعِیْن

ترجمہ: ہم صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ ساری کائنات کا پروردگار صرف اللہ ہے۔ تمام اختیار اور طاقتیں اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لیے صحیح راستہ یہی ہے کہ انسان اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کے لیے صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرے' کیونکہ انسان کا اصل اور صحیح مددگار صرف اللہ تعالیٰ کی ہستی ہے۔ وہی ہر چھوٹی بڑی مشکل کا حل فرما سکتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کو پکارنے کے بجائے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا ہی صحیح دروازہ کھٹ کھٹانے کے برابر ہے۔

دنیا کے کئی علاقوں میں جہاں دینی علم کم یاب' نایاب یا ناقص ہے' کئی ناسمجھ لوگ اللہ کو چھوڑ کر طرح طرح کے بتوں اور دوسرے لوگوں سے مدد مانگتے نظر آتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ گم راہ لوگ جن برگزیدہ ہستیوں کا نام لے لے کر مدد کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں وہ خود بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی سے مدد مانگا کرتے تھے۔ ان نیک لوگوں کا پختہ ایمان تھا اور وہ اس کا صاف صاف اعلان بھی کرتے رہتے تھے کہ بندے کا اصل مددگار صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو مدد کے لیے پکارنا ایمان کی کم زوری اور روح اسلام سے لاعلمی کا بھونڈا مظاہرہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بجائے کسی اور سے کسی قسم کی مدد کا خواہاں ہونا قرآن کریم کی پہلی سورت ہی میں اللہ تعالیٰ کے واضح حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی ہے۔ اس طرح کی نازیبا حرکت سے بچنا ہر مسلمان کے لیے بے حد ضروری ہے۔

ڈاکٹر عبدالرؤف

ٹپکا آم

فاروق حسن جانڈیو

اب تو میں خاصا بڑا ہو گیا ہوں مگر یہ کہانی ان دنوں کی ہے جب گرمیوں میں روزے آتے تھے۔ میں نے عاصم کی ناک پر مکا مار کر اسے لہولہان کر دیا تھا۔ اس کی ناک سے تیزی کے ساتھ خون بہ رہا تھا۔ بدلے میں عاصم نے ایک بڑا سا کچا آم کس کر مارا تھا۔ میں چکرا کر گر پڑا تھا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑا کراہ رہا تھا۔ باغ میں ہمارے ساتھ کام کرنے والے دو مزدور لڑکے میرے ہاتھ پیر مل رہے تھے۔ دو مزدور لڑکے کولر سے ٹھنڈے پانی کے گلاس بھر بھر کر عاصم کے سر پر ڈالتے جا رہے تھے۔ باغ کا مالک حاجی سلطان پریشانی کے عالم میں کبھی میرے پاس آکر لڑکوں کو مزید تیز رفتاری سے مالش کرنے کی ہدایت کر رہا تھا۔ کبھی عاصم کے پاس جا کر دیکھ رہا تھا کہ خون بہنا بند ہوا کہ نہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں پٹے ہوئے پہلوانوں کی طرح کھڑے ہو کر، شرمندگی کے مارے بلاوجہ سر کھجا رہے تھے۔

ہمارے جھگڑے کی وجہ ایک ٹپکا آم تھا۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ ٹپکا آم اس آم کو کہتے ہیں جو درخت ہی پر پک جاتا ہے۔ بازار میں لائے جانے والے آم زیادہ تر پال ڈالے ہوئے ہوتے ہیں۔ "پال" کہتے ہیں، مصنوعی طریقے سے پھلوں کو پکانے کے طریقے کو۔

ہاں .... تو میں آپ کو جھگڑے کی وجہ بتا رہا تھا۔ ہمارے سیٹھ نے سب مزدوروں کو اجازت دے رکھی تھی کہ جسے بھی کام کرتے ہوئے کوئی ٹپکا آم ملے، وہ چاہے تو اسے کھا سکتا ہے۔ یوں ہم روزانہ بہت سے آم کھاتے رہتے تھے۔

تمام لڑکوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اچھی نسل کے ٹپکے آم تلاش کر کے کھائیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب لوگ کام کے مقررہ وقت سے پہلے باغ میں پہنچنے کے چکر میں رہتے تھے۔ اس دن عاصم اور میں اکٹھے باغ میں داخل ہو کر ایک ایسے اکلوتے پیڑ کی طرف دوڑ پڑے تھے جو پورے باغ میں سب سے لذیذ نسل کے آموں کا پیڑ تھا۔ اس پیڑ میں ابھی تھوڑے تھوڑے "ٹپکے" ہونا شروع ہوئے تھے۔

عاصم دوڑنے میں مجھ سے تیز تھا۔ میں کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ البتہ دور سے ہی مجھے اس درخت کے نیچے گرا ہوا ٹپکا آم نظر آگیا تھا۔ میں نے اونچی آواز لگا کر کہا "عاصم....! اس پیڑ کے نیچے گرا ہوا ٹپکا آم پہلے میں نے دیکھا ہے وہ نہیں اٹھانا....!"

"دیکھنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو پہلے پہنچ کر اٹھائے آم اسی کا ہوتا ہے" عاصم نے جھک کر آم اٹھاتے ہوئے کہا۔

"لاؤ.... مجھے دو آم....!" میں نے بگڑتے ہوئے قریب جا کر کہا۔

"نہیں دیتا..... تم نے جو کرنا ہے کر لو....." عاصم نے

بھی بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ بات بڑھتی گئی۔ کچھ دیر تک تو ہم ایک دوسرے کو دھمکاتے رہے۔ پھر نوبت ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ ہم گتھم گتھا ہو گئے۔ اسی وقت باغ کا مالک اور دوسرے مزدور بھی باغ میں پہنچ گئے۔ وہ دور سے ہی چیخ چیخ کر ہمیں لڑنے سے منع کرنے لگے۔ مگر ہم دونوں میں سے کوئی ہٹنے کو تیار نہیں تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو گرانے کے لیے زور لگائے جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد سیٹھ اور دوسرے مزدور لڑکے پہنچ گئے۔ انہوں نے پکڑ کر ہم دونوں کو علیحدہ کیا۔ علیحدہ ہوتے ہی میں نے ایک زور دار مکا عاصم کی ناک پر جڑ دیا۔ اس کی ناک سے خون کا فوارہ نکل پڑا۔ عاصم نے جھکی ہوئی آم کی ٹہنی سے ایک کچا آم توڑا اور کس کر میرے سر پر دے مارا۔ چوٹ لگنے پر میرا سر چکرانے لگا۔ میں تیورا کر زمین پر گرا اور نیم بے ہوشی کے عالم میں کراہنے لگا۔

سیٹھ ٹھنڈے پانی کا کولر اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس نے دو مزدوروں سے کہا کہ عاصم کے سر اور چہرے پر ٹھنڈا پانی ڈال کر خون روکنے کی کوشش کریں۔ دو لڑکوں کو میرے ہاتھ اور پیر ملنے کے لیے کہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم دونوں کی حالت بہتر ہوئی۔

سیٹھ نے ڈانٹ ڈپٹ کر ہماری صلح کروائی اور فیصلہ کیا کہ ٹپکا آم ہم دونوں کے بجائے کسی اور مزدور کو دیا جائے۔ اس طرح مفت کی پٹائی ہی ہمارے حصے میں آئی۔

مغرب تک ہم کام کرتے رہے۔ کام سے فارغ ہو کر ہم اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔ اس رات رمضان المبارک کا چاند نظر آگیا۔ شروع میں میں بتا چکا ہوں کہ ان دنوں گرمیوں کے موسم میں روزے آتے تھے۔ چاند نظر آتے ہی سب لوگ ایک دوسرے کو مبارک باد دینے کے علاوہ سحری کے لیے پیشگی تیاریوں میں لگ گئے۔ امی جان نے بھی ضروری سامان دکان سے منگوا لیا۔ ہمارے گھر میں تمام افراد روزے رکھتے تھے۔

سحری کرتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ باقی سب مزدور تو روزے سے ہوں گے، میں روزہ نہ رکھوں۔ پھر چن چن کر خوب مزے دار ٹپکے کھاؤں گا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ادھوری ہانک لگائی۔ "میں تو روزہ....." پھر ادھورا جملہ ہی چھوڑ دیا۔ مجھے یاد آگیا کہ اعلانیہ روزہ نہ رکھا تو امی جان سر پر سینکڑوں جوتیاں مارنے کے باوجود "بوزہ" ہونے نہ دیں گی۔ بوزہ کا مطلب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے..... یعنی بے روزہ....!

میں نے سیر ہو کر سحری بھی کھائی اور روزے کی نیت بھی نہیں باندھی۔ اس دن جلدی کی ضرورت نہیں تھی۔ صبح کو آرام سے ٹہلتا ہوا باغ کی طرف گیا۔ سیٹھ اور باقی مزدور مجھ سے پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ میرے پہنچتے ہی عاصم نے کہا "روزہ مبارک ہو فاروق"۔

"ہی ہی ہی..... میرا تو روزہ نہیں ہے ....." میں نے بتیسی نکال کر ہنستے ہوئے کہا۔

میری بات سن کر چند لمحے تک سب ہی خاموشی اور حیرانگی سے مجھے دیکھنے لگے۔ پھر طوفان کی مانند، مجھ پر طنزیہ جملے کسے جانے لگے۔ البتہ سیٹھ نے صرف اتنا کہا تھا کہ "فاروق! روزہ فرض عبادت ہے۔ یہ عبادت کے ساتھ ساتھ نیکی کی تربیت اور جسمانی صحت کے لیے بھی ضروری ہے"۔

میں شرمندگی کے مارے مزدور لڑکوں کی طنز اور سیٹھ کی نصیحت سر جھکا کر خاموشی سے سنے جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ کچھ دیر چلا پھر سب لوگ کام میں مصروف ہو گئے۔ کام کرتے کرتے دل میں خیال آیا کہ کچھ ٹپکے کھا لوں۔ یہ سوچ کر قریب ہی ٹوکرے میں پڑے ہوئے ٹپکوں میں سے ایک اٹھا کر، ندیدوں کی طرح اس میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ یہ دیکھ کر سیٹھ نے بری طرح بگڑ کر کہا "فاروق! تم کو شرم نہیں آتی۔ ایک تو روزہ نہیں رکھا الٹا روزہ داروں کے سامنے آم کھا کر، احترام کا دامن بھی چھوڑ رہے ہو.....!"

سیٹھ کا لہجہ دیکھ کر میں لرز گیا۔ شرمندہ الگ ہوا۔ میں نے فوراً آم منہ سے نکال کر ایک طرف رکھ دیا۔ شرمندگی کا اتنا شدید حملہ ہو گیا تھا کہ جی میں آیا اسی وقت

نیت باندھ کر روزہ رکھ لوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ آم کا کچھ رس میرے پیٹ میں جا چکا ہے۔ اس لیے نیت نہیں باندھی جا سکتی۔ میں پھر سے کام میں مصروف ہو گیا۔ کچھ دیر بعد پھر دل میں خیال آیا کہ کچھ ٹپکے چھپا کر' بہانے سے کسی طرف جا کر کھالوں۔ ابھی سوچا ہی تھا کہ وہاں سے گزرتے ہوئے' گاؤں کی مسجد کے امام نے سلام کیا۔ سیٹھ نے سلام کا جواب دے کر کہا "مولوی صاحب! کچھ ٹپکے آم پڑے ہیں۔ یہ لے جائیں۔ شام کو افطاری کے وقت مسجد میں بانٹ دیجیے گا"۔

سیٹھ کی یہ بات سن کر' جی میں آیا کہ بول دوں' چند ٹپکے میرے لیے چھوڑ دیں۔ مگر میں ہمت نہ کر سکا۔ اب تو صرف وہ اکلوتا ٹپکا باقی بچا تھا۔ جسے منہ مار کر ایک طرف رکھ چھوڑا تھا۔ بے اختیار میں نے اس طرف دیکھا اور غصے کے مارے خون کھول اٹھا۔ ایک گلہری مزے سے اس آم کو کھا رہی تھی۔ میں نے اچھل کر ایک اینٹ کا ٹکڑا اٹھایا۔ اسی وقت سیٹھ نے کہا "کیا ہوا فاروق' کس کو مار رہے ہو......؟"

میں نے جواب دیئے بغیر اینٹ کا ٹکڑا کھینچ کر گلہری کی طرف پھینکا۔ مگر غصے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو گیا۔ گلہری ٹچ.... ٹچ کی آواز نکالتی' بھاگ کر ایک پیڑ پر چڑھ گئی۔ تب سیٹھ نے مسکرا کر کہا "فاروق میاں! روزگار' زندگی اور موت پر اللہ میاں کا اختیار ہے۔ یہ آم گلہری کے نصیب میں تھا"۔

وہ پورا دن میں نے بھوکے گزارا۔ سیٹھ پانی کا کولر بھی اس دن نہیں لایا تھا۔ مجبوراً چھپ چھپا کر میں نے ایک کھال سے گرم اور گدلا پانی پیا۔ اس پانی میں شاید جراثیم تھے۔ میرے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔

مغرب سے کچھ دیر پہلے سیٹھ نے کام بند کروایا اور کہا "سب لوگ پہلے مسجد جائیں افطاری اور نماز سے فارغ ہو کر پھر اپنے گھروں کو جائیں" میں نے بھی یہ سوچ کر انکار نہیں کیا کہ مسجد اور گھر دونوں جگہ افطاری کا حصہ حلال کر کے' کچھ تو کسر پوری کرلوں۔ مگر دل کی دل ہی میں رہ گئی۔ ابھی مسجد کے دروازے پر ہی پہنچے تھے کہ پیٹ میں شدید مروڑ اٹھا۔ دوڑ کر بیت الخلا میں گھسا۔ وہاں پر مجھے کافی دیر لگ گئی۔ وہاں سے نکل کر وضو بنایا۔ تب تک مسجد میں آیا ہوا افطاری کا سامان ختم ہو چکا تھا۔ مجھے گھر پہنچتے ہی متلی بھی ہونے لگی۔ امی جان نے بے چین ہو کر کہا "ہائے اللہ میرے روزے دار بیٹے کو کیا ہو گیا"

میں دل ہی دل میں اپنے لیے روزے دار کا خطاب سن کر خوب شرمندہ ہوا اور بے اختیار کہہ دیا "امی جان' آج میرا روزہ نہیں تھا"۔

"کیوں نہیں تھا؟ سحری تو ہماری ساتھ کھائی تھی....!" امی جان نے ایک دم بھڑک کر کہا۔

میں نے اب سچ بولنے کی ٹھان لی تھی۔ اپنے لالچ اور خود پر بیتے ہوئے پورے دن کی روداد سنا ڈالی۔ وہ سن کر امی جان نے کہا "تو یوں کہو کہ اللہ میاں نے تمہیں روزہ نہ رکھنے کے جرم میں ذلیل و خوار کیا"۔

"مگر امی جان....! جو لوگ ایک بھی روزہ نہیں رکھتے ان کو تو کچھ بھی نہیں ہوتا" میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

امی جان نے غصے پر قابو پا کر سمجھاتے ہوئے کہا "فاروق بیٹے! جو بندہ نیا نیا بگڑنے لگتا ہے' اللہ اسے راہ راست پر لانے کے لیے اسی دنیا میں سزا دیتا ہے۔ اگر پھر بھی نہیں سدھرتا تو پھر اس کی رسی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے تاکہ قیامت کے روز اس کی خوب خبر لی جا سکے۔

قیامت کے روز کا سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور بے اختیار کہہ اٹھا۔ "یا اللہ معاف فرما....! میں اب روزے نہیں چھوڑوں گا"۔ یہ الفاظ ادا ہونے کے بعد معجزانہ طور پر میرے پیٹ کا مروڑ اور جی متلانا کم ہونے لگا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد میری طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی تھی۔ اس واقعے کو دس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے اور اللہ کے کرم سے اس دن کے بعد میں نے کسی رمضان میں' کوئی روزہ نہیں چھوڑا۔

☆ ☆ ☆

Sharjeel Ahmed Excellent

جنگل بن گیا منگل

محمد معروف چشتی

جنگل کے بادشاہ کا دربار لگ رہا تھا۔ تمام جانور آ گئے تو بادشاہ سلامت کرسی پر آبیٹھے۔ جانوروں نے جھک کر سلام کیا۔ بادشاہ سلامت بولے "آج ایک بہت اہم مسئلے کے حل کے لیے آپ لوگوں کو بلایا گیا ہے۔ پچھلے چند ماہ سے دیکھنے میں آرہا ہے کہ جنگل کے جانوروں میں وہ پہلے جیسی اخوت نہیں رہی۔ خاص طور پر ذمہ دار جانور بھی جنگل کی فلاح و بہبود کے لیے کچھ نہیں کر رہے۔ اس کی روک تھام کے لیے کوشش کی گئی کہ بڑی عمر کے جانوروں کی اصلاح کی جائے تاکہ نئی نسل پر اس کے برے اثرات مرتب نہ ہوں۔ کئی تربیتی نشستیں منعقد کی گئیں مگر اس مقصد میں بالکل کامیابی نہیں ہوئی اور نئی نسل کا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے۔ اگر وہ بھی اسی ماحول میں پلے بڑھے تو ان کی عادتیں مزید خراب ہوں گی۔ للہذا مسئلہ اب یہ ہے کہ ان کی بہتر تعلیم و تربیت کیسے کی جائے اور جنگل کے ماحول کو کیسے اچھا بنایا جائے؟"

تمام جانور سوچ میں پڑ گئے۔ سب سے پہلے لومڑی بولی "ہمیں دوسرے جنگلوں سے تربیت یافتہ استاد منگوانے چاہیں"۔

"لڑائی جھگڑا کرنے والے جانوروں کو جنگل سے نکال دیا جائے تاکہ ماحول ٹھیک ہو سکے" زیبر بولا۔

"سب سے زیادہ پیار و محبت سے رہنے والے جانوروں کو وظیفے دیے جائیں تاکہ دوسرے جانوروں میں بھی شوق پیدا ہو" زرافے نے کہا۔
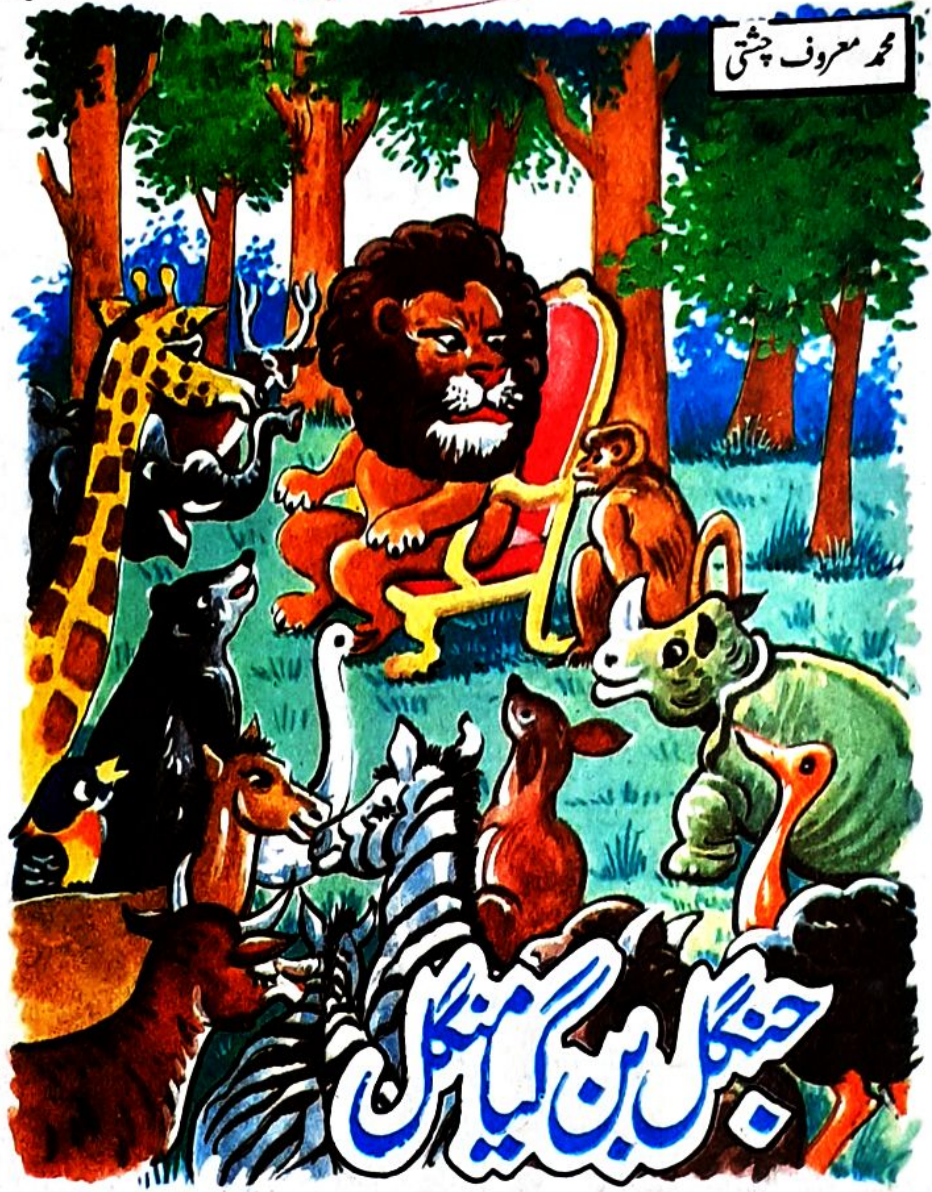
"میرا ایک مشورہ ہے۔ خاموشی سے سن لیں" گدھے نے کہا' جس نے خود اس سے پہلے ڈھینچوں ڈھینچوں کی آواز کے ساتھ آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ "اگر ہم اپنے اردگرد کے ماحول پر نگاہ دوڑائیں تو سب سے زیادہ مہذب اور تعلیم و تربیت سے آراستہ جو مخلوق نظر آئے گی وہ انسان ہے۔ ہم کبھی انسانوں کی بستی میں تو نہیں گئے مگر ہمارے جنگل میں آکر ایندھن اکٹھا کرنے والے بابا جی کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ ہمارے ساتھ نہایت شفقت برتتے ہیں۔ ہمیں نقصان بھی نہیں پہنچاتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان بہت شریف اور صلح جو ہے۔ ہم اپنے بچوں کو انسانوں کی بستی میں بھیج دیں۔ جہاں سے

وہ اچھی تربیت حاصل کر کے آئیں اور جنگل میں اچھا ماحول پیدا کریں"۔

"بہت اچھا مشورہ ہے" ہاتھی نے تائید کی۔

"مجھے بھی پسند آیا" بندر نے کہا۔

"میں بھی اس کی تائید کرتا ہوں" خرگوش بولا۔

باری باری سارے جانوروں نے گدھے کے مشورے کو پسند کیا اور طے یہ ہوا کہ وہ جانور جن کے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں اور ان بچوں نے جنگل کی زیادہ باتیں بھی نہیں سیکھیں' وہ انہیں چھ ماہ کے لیے انسانوں کی بستیوں میں چھوڑ آئیں۔ چناں چہ ایسا ہی کیا گیا۔ تمام جانور اپنے چھوٹے بچوں کو مختلف شہروں میں چھوڑ آئے۔ چھ ماہ تک وہ اپنے بچوں کی بہتر تربیت اور جنگل کی فلاح کے لیے ان کی جدائی برداشت کرتے رہے۔ بادشاہ سلامت سمیت سارے جانور مطمئن اور خوش تھے کہ اب جنگل کے حالات بہتر ہو جائیں گے اور ایک دفعہ پھر وہی پرانی رونق اور بھائی چارہ کی فضا لوٹ آئے گی۔

بچوں کو گئے ہوئے پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ مقررہ مدت ختم ہونے سے پہلے ہی جانوروں نے تربیت یافتہ بچوں کے استقبال کے لیے جنگل کو سجانا شروع کر دیا تھا۔ ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ جیسے جیسے بچوں کی واپسی کے دن قریب آ رہے تھے' والدین بہت خوش نظر آ رہے تھے اور خوشی سے ان کے آنسو نکل نکل آتے تھے۔

ابھی چھ ماہ ختم ہونے میں بیس دن باقی تھے کہ ایک رات جنگل کو آگ لگ گئی۔ تمام جانور بہت پریشان تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگ کیسے لگ گئی۔ ہر کوئی افراتفری میں بھاگ رہا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے صبح تک آگ پر قابو پا لیا گیا مگر اس کا سبب معلوم نہ ہو سکا۔ دوسرے دن بے چارے خرگوش کا گھر لوٹ لیا گیا اور اس کے تین معصوم بچوں کو مار ڈالا گیا۔ ایک کی لاش ملی جب کہ دو کا صرف خون پڑا تھا۔ چند دن بعد جنگل کا مغربی حصہ بری طرح تباہ کر دیا گیا تھا۔ چھوٹے بڑے تمام درخت اکھاڑ دیئے گئے تھے اور اس طرف سے گزرنے والی ندی کے دونوں کنارے تباہ ہو گئے تھے۔ جس سے جنگل میں سیلاب آنے کا خطرہ تھا۔ اگر ہرن بروقت اطلاع نہ دیتا تو جنگل ڈوب جاتا۔ غرض ہر روز کوئی نہ کوئی نئی مصیبت جنگل پر نازل ہوتی۔

جانوروں کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ ہر جانور رات جاگ کر گزارتا۔ بادشاہ خود بہت پریشان تھا۔ جنگل کی پولیس میں اضافہ کر دیا گیا مگر کوئی خاطر خواہ نتائج نہ نکلے۔ اب تو تمام جانور اور زیادہ شدت سے بچوں کا انتظار کرنے لگے۔

ایک رات پولیس کا ایک اہل کار بندر ایک درخت پر بیٹھا ڈیوٹی دے رہا تھا کہ یکایک اس کے درخت کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ گرتے گرتے بچا۔ اس نے پیچھے مڑ کر نیچے دیکھا تو ایک ہاتھی درخت کو ٹکریں مار کر گرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی سونڈ کو درخت کے گرد لپیٹ لیا مگر اسی وقت بندر چھلانگ لگا کر دوسرے درخت پر چلا گیا

اور پھر وہاں سے "جنگل محافظ پولیس" کی طرف بھاگا۔
"سر سر' میں نے.... میں نے دہشت گرد دیکھا ہے؟"
بندر نے بے تحاشہ ہانپتے ہوئے کہا۔
چیتا جو پہلے آرام سے لیٹا ہوا تھا' یک دم اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسے بجلی کا کرنٹ لگا ہو۔
"کدھر ہے فوراً چلو" چیتے نے کہا اور ساتھ ہی سیٹی بجا دی۔ خود بندر کے ساتھ بھاگا۔ پولیس کا جو بھی اہل کار انہیں بھاگتے دیکھتا وہ بھی ان کے پیچھے ہو لیتا۔ جلد ہی وہ ہاتھی تک پہنچ گئے۔ ہاتھی ایک درخت گرا کر دوسرے درخت کو ٹکریں مار رہا تھا۔ ہاتھی نے جب انہیں آتے دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ یہ تو ہمارے ہی جنگل کا لگتا ہے۔ مگر اس نے چہرے پر نقاب ڈال رکھا تھا۔ اس سے پہلے کہ چیتا ہاتھی تک پہنچتا' سامنے سے ایک ریچھ نکل آیا۔ وہ بھی سیٹی کی آواز سن کر آیا تھا۔ چناں چہ چیتے اور ریچھ نے مل کر آسانی سے ہاتھی کو گرفتار کر لیا۔ فوراً اس کو تفتیشی مرکز میں لے جایا گیا۔ اس نے ایک پورے گروہ کا انکشاف کیا جو اس ساری دہشت گردی میں ملوث تھا۔ راتوں رات مزید نفری کے ساتھ اس گروہ کے مخصوص اڈے پر چھاپہ مارا گیا اور پورا گروہ صبح تک گرفتار کر لیا گیا۔ صبح سویرے دربار لگا اور بادشاہ سلامت جو جنگل کی تباہی کے غم سے کم زور ہو چکے تھے۔ کمزور سی مسکراہٹ کے ساتھ شاہی کرسی پر آبیٹھے۔
"میرے عزیز ساتھیو! میں بغیر کسی تاخیر کے آپ سب کو جنگل میں تباہی پھیلانے والے دہشت گردوں کی گرفتاری کی خوش خبری سناتا ہوں اور مبارک باد دیتا ہوں"۔
بے تحاشہ شور مچ گیا۔ خوشی کے مارے سارے جانور ایک دوسرے سے گلے ملنے لگے اور "بادشاہ سلامت' زندہ باد۔ بادشاہ سلامت' زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ چند منٹوں کے بعد جب شور تھما تو مجرموں کو دربار میں پیش کیا گیا۔ مگر انہوں نے چہروں پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ سارے دم سادھ کر بیٹھ گئے۔ اور ان کے بے نقاب ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

"میری قوم کے لوگو! ہماری پولیس کی ان تھک محنت سے آخر کل رات مجرم پکڑے گئے۔ آپ کے سامنے ابھی اور اسی وقت انہیں پھانسی دی جائے گی۔ مگر میں چاہتا ہوں کہ پہلے ان کو بے نقاب کر کے سب کو دکھایا جائے"۔
"جیسے ہی سب انسپکٹر گوگو ریچھ نے ان کے چہروں سے نقاب ہٹائے تمام حاضرین کے منہ سے چیخیں بلند ہوئیں۔ چند ایک تو بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ مختلف آوازیں بلند ہوئیں۔
"یہ کیا؟"
"نہیں' نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟"۔
"یہ تو میرا بچہ ہے"۔
"میرا بچہ ایسا نہیں ہو سکتا"۔
"یہ تو اخلاقی تربیت کے لیے گئے تھے"۔
"بادشاہ سلامت یہ کیا ماجرا ہے؟ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا" گینڈا بولا۔
"آپ کے سوالوں کے جواب آپ کے بچے ہی دیں گے" چیتے نے جواب دیا۔
"ڈنگی! تم بتاؤ کیا ماجرا تھا؟" چیکو بندر نے اپنے بچے سے سختی سے پوچھا جو مجرموں کی قطار میں سر جھکائے کھڑا تھا۔
"ابا جی! بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے موجودہ دور کے انسانوں کی نفسیات سمجھے بغیر ہمیں انسانوں میں بھیج دیا۔ اب انسان اتنا اچھا نہیں ہے جتنا آپ سمجھتے ہیں۔ ہاں پہلے دور میں ضرور ہوتا ہو گا۔ ہمارے جنگل میں آنے والے بابا جی شہر کے انسانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ شہروں کے انسان تو بے حد خون خوار اور بدتہذیب ہیں۔ ان میں ذرہ بھر اخوت نہیں رہی۔ اور نہ ہی ان کے دل میں خلوص ہے۔ وہ تو بات بے بات ایک دوسرے کا خون بہانے پر تل جاتے ہیں اور اپنے ہی گھروں اور شہروں کو برباد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دشمنوں سے رشوت لے کر اپنی ہی بستیاں جلا دیتے ہیں۔ اور تو اور ابا جی' وہ اپنے دشمنوں کو

پہچاننے کے باوجود ان کی ہر بات مان لیتے ہیں۔

بس ابا جی، ہم نے جو کچھ انسانوں میں دیکھا وہی سیکھ لیا اور اسی پر عمل کیا۔ اسی لیے تو جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہمیں جنگل سے کافی دور دوسرے جنگل کے جانور ملے جنہیں پتا تھا کہ ہم انسانوں کی عادتیں اپنا چکے ہیں۔ انہوں نے ہمیں اچھے اچھے کھانوں اور شکار کا جھانسا دے کر کہا کہ ہم اپنے جنگل میں آگ لگا دیں اور اپنے جانوروں کو نقصان پہنچائیں۔ ہم کیا کرتے۔ انسانوں کی عادتیں ہمارے اندر اتنی رچ بس گئی تھیں کہ ہم نے فوراً ہاں کر دی اور اپنا ہی جنگل تباہ کر بیٹھے۔

ابا جان ہمیں معاف کر دیں۔ ہمیں اب احساس ہوا ہے اپنے نقصان کا! ہمیں پھانسی سے بچالیں"۔

"نہیں.... ایسا نہیں ہو سکتا" بادشاہ دھاڑا۔

"حضور، ہمارے حال پر رحم فرمائیں۔ ہم آئندہ ایسا نہ کرنے کی قسم کھاتے ہیں۔ ابھی ہم اتنے انسان بھی نہیں بنے کہ اپنی غلطیوں سے سبق حاصل نہ کر سکیں" بندر نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

اکثر والدین اپنی اولاد کا یہ حال دیکھ کر نیچے منہ کیے آنسو بہا رہے تھے۔

"نہیں بیٹے یہ نہیں ہو سکتا.... آج ہم اپنے اندر انسانوں کو جگہ دے کر اپنے جنگل کو ہمیشہ کے لیے جہنم نہیں بنا سکتے۔ بیٹا، آج ہم تمہاری جدائی کا دکھ تو برداشت کر سکتے ہیں مگر ہمیشہ کے لیے اپنی سلطنت کی خوشیوں کو برباد نہیں کر سکتے۔ ہاں اتنا ہو سکتا ہے کہ تمہاری جان بخشی کر دی جائے مگر تمہیں واپس انسانوں کی بستی میں جانا ہو گا.... اور ہمیشہ وہیں رہنا ہو گا" یہ کہتے ہوئے بادشاہ رو پڑا۔

"نہیں، ہم اب انسانوں کی بستی میں واپس نہیں جائیں گے۔ نن نن نہیں....؟؟"

مجرم جانور یہ کہتے رہے مگر ان کے ہی والدین اور بھائی بہنوں نے انہیں دھکے دیتے ہوئے جنگل کی حدود سے باہر نکال دیا اور ان کا جنگل اب پر سکون ہے مگر وہ سب جانور آج ہمیں انسانوں کی بستیوں میں غلامی کی زندگی بسر کرتے اور دن رات کام کرتے نظر آتے ہیں۔ جیسے قید با مشقت جھیل رہے ہوں"۔

سنہری چابی

نذیر انبالوی

صبح ساڑھے سات بجے کا وقت تھا۔ ابا جان گاڑی میں بیٹھے فائزہ اور صائمہ کو بلانے کے لیے ہارن بجا رہے تھے۔ صائمہ تو فائل اور کتابیں لیے تیار کھڑی تھی' جب کہ فائزہ ہر روز کی طرح اپنے کمرے میں اپنی چیزیں تلاش کر رہی تھی۔

"فائزہ اب آ بھی جاؤ....."

"بس آ رہی ہوں" فائزہ بولی۔

ابا جان نے پھر ہارن بجایا۔

"فائزہ جلدی کرو' دیر ہو رہی ہے" صائمہ چلائی۔

"میری جراب گم ہو گئی ہے' اسے تلاش تو کرنے دو" فائزہ کی بات سن کر صائمہ بڑبڑائی۔

"اس کی ہر روز کوئی نہ کوئی چیز ضرور گم ہوتی ہے"۔

ابا جان نے ایک مرتبہ پھر ہارن بجایا۔ اس بار ہارن نے کام کر دکھایا۔ فائزہ اپنی فائل اور کتابیں لیے اپنے کمرے سے باہر آ گئی۔ صائمہ نے اسے ناخوش گوار انداز میں گھورا۔ دونوں گاڑی کی طرف بڑھیں۔

"سوری پاپا!" فائزہ نے کہا۔

"آج کیا چیز گم ہو گئی تھی؟" ابا جان نے پوچھا۔

"آج اس کی جراب نہیں مل رہی تھی" صائمہ نے گاڑی کا دروازہ بند کرتے کہا۔

"صائمہ یہ دیکھو" فائزہ نے صائمہ کو مخاطب کیا۔

"کیا دیکھوں؟"

"دونوں جرابوں کا رنگ دیکھو"۔

"جرابوں کا رنگ" یہ کہ کر صائمہ نے جرابوں پر نظر ڈالی تو ایک جراب سرخ اور دوسری سفید تھی۔

"فائزہ یہ سب کیا ہے؟"

"وقت کا یہی تقاضا تھا کہ سفید جراب کے بجائے سرخ جراب پہن لی جائے۔ میں سفید جراب کو تلاش کرتی رہتی تو ابھی تک ہم لوگ گھر ہی میں ہوتے"۔

"کالج میں سہیلیوں نے ان دو رنگی جرابوں کو دیکھ لیا تو تمہارا خوب مذاق اڑائیں گی" صائمہ بولی۔

"اڑانے دیں مذاق' اب سفید جراب نہیں مل رہی تھی تو کیا کرتی" فائزہ فوراً بولی۔

"تم نے جرابیں رکھی کہاں تھیں؟" صائمہ نے پوچھا۔

"اپنی الماری میں" فائزہ نے جواب دیا۔

ابا جان ان کی باتوں سے بے نیاز گاڑی چلانے میں مصروف تھے۔ وہ دونوں کو کالج چھوڑ کر اپنے دفتر چلے گئے۔

فائزہ اور صائمہ دونوں جڑواں بہنیں تھیں۔ ان کا کوئی بھائی نہ تھا۔ دونوں کالج کے دوسرے سال میں پڑھتی تھیں۔ ان کے مضامین میں فرق ہونے کی وجہ سے دونوں کے سیکشن الگ الگ تھے۔ جڑواں ہونے کی وجہ سے دونوں کی شکل و صورت تو تقریباً ایک جیسی تھی مگر ان کی عادات مختلف تھیں۔ صائمہ اپنی چیزوں کا بہت خیال رکھتی جب کہ فائزہ بہت لاپروا تھی۔ وہ جہاں جی چاہتا اپنی چیزوں کو پھینک دیتی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے اپنی چیزیں کبھی بھی وقت پر نہ

ملتی تھیں۔ صبح کے وقت تو لازماً اسے کسی نہ کسی چیز کی تلاش کے لیے پریشان ہونا پڑتا تھا۔

کچھ دن قبل کی بات ہے، فائزہ کی سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک نئی سہیلی شازیہ بھی شامل تھی۔ وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتوں میں مصروف تھی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں اپنی بچپن کی تصویروں کا ذکر کیا تو شازیہ نے کہا "البم لاؤ تاکہ میں بھی دیکھوں کہ تم بچپن میں کیسی تھی"۔

"ابھی منگواتی ہوں، تم خود دیکھ لینا کہ میں کیسی تھی" یہ کہ کر فائزہ نے صائمہ کو آواز دی۔

"صائمہ میری الماری سے تصویروں کا البم تو اٹھا لانا"۔

"اچھا" صائمہ کی آواز آئی۔

صائمہ نے تھوڑی دیر بعد ڈرائنگ روم میں آکر فائزہ کو بتایا "البم تو الماری میں نہیں ہے"۔

"تم دھیان سے تو دیکھتیں، وہیں ہو گا"۔

"میں نے الماری کے سارے خانوں میں دیکھ لیا ہے، البم وہاں نہیں ہے"۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں خود دیکھتی ہوں" فائزہ یہ کہ کر اپنے کمرے میں گئی۔ اس نے الماری کے سارے حصوں میں البم تلاش کیا مگر وہاں ہوتا تو ملتا۔ اس کی سہیلیاں البم دیکھے بغیر چلی گئیں۔ وہ شام تک تلاش کرتی رہی۔ آخر صائمہ نے پرانی کتابوں کے ڈھیر سے البم برآمد کر لیا۔ فائزہ نے البم کو دیکھتے ہوئے پوچھا "آخر یہ پرانی کتابوں میں کس طرح چلا گیا تھا؟"

"تمہاری لاپروائی کی وجہ سے"۔

"میں لاپروا کب ہوں" فائزہ فوراً بولی۔

"اچھا تو تم لاپروا نہیں ہو، تم اگر لاپروا ہوتیں تو لگتا ہے خود بھی گم ہو جاتیں"۔

فائزہ نے صائمہ کے طنزیہ انداز کو بھانپ لیا۔ یہ البم کسی اور نے پرانی کتابوں میں رکھا ہو گا۔ مجھ پر یہ خواہ مخواہ کا الزام ہے کہ میں لاپروا ہوں" فائزہ بولی۔

صائمہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

فائزہ نے اس دن بھی اپنی غلطی تسلیم نہ کی تھی۔ جب ایف اے کے دوسرے سال کے امتحان کی رول نمبر سلپ اسے نہیں مل رہی تھی۔ گھر میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ فائزہ رول نمبر سلپ نہ ملنے کی وجہ سے رونے لگی تھی۔

"تم نے رول نمبر سلپ کہاں رکھی تھی؟" امی جان نے پوچھا۔

"ایک کتاب میں" فائزہ بولی۔

"وہ کتاب کہاں ہے؟" ابا جان نے پوچھا۔

"اگر اسے کتاب کا علم ہوتا تو روتی ہی کیوں" صائمہ بھی بول پڑی۔

"میں نے کتاب اپنی میز پر رکھی تھی"۔

"کتاب میز پر کب رکھی تھی؟" صائمہ نے پوچھا۔

"کل" فائزہ نے جواب دیا۔

اس بار بھی صائمہ نے کتاب بیڈ کے گدے کے نیچے سے تلاش کر لی۔

"میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کتاب گدے کے نیچے کیسے چلی گئی تھی" فائزہ بولی۔

"تمہاری لاپروائی کی وجہ سے"۔

"میں لاپروا نہیں ہوں۔ نہیں ہوں، نہیں ہوں" فائزہ نے احتجاج کیا۔

"تم میرا شکریہ ادا کرو۔ اگر رول نمبر سلپ نہ ملتی تو پھر پوچھتی کہ تم لاپروا ہو یا نہیں"

یہ سن کر فائزہ نے مسکرا کر صائمہ کا شکریہ ادا کر دیا۔

امتحان کے بعد دونوں گھر میں فارغ تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ فراغت کے دن چچا جان کے ہاں کراچی میں گزارے جائیں۔ دونوں نے اباجان سے بات کی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ کراچی ان کے ساتھ کون جائے۔ امی جان گھر اور ابا جان دفتر میں مصروف تھے۔ آخر یہی فیصلہ ہوا کہ

لاہور سے ابا جان انہیں جہاز میں سوار کروا دیں گے اور کراچی کے ہوائی اڈے پر چچا جان انہیں لے لیں گے۔ ابا جان نے بکنگ کروا کر کراچی اپنے بھائی کو فون کر دیا۔ انہوں نے 20 نومبر کو شام 6 بجے کے ہوائی جہاز سے کراچی جانا تھا۔

20 نومبر کو دوپہر 12 بجے کے قریب چچی جان نے کراچی سے فون کر کے انہیں کہا کہ آتے ہوئے وہ ایک عمدہ سی ملتانی گرم شال اور خوب صورت سی چوڑیوں کا سیٹ لیتی آئیں۔ چچی جان کے فون پر دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ وین یا رکشے میں دھکے کھانے کے بجائے اپنی گاڑی کا انتظار کیا جائے۔ ابا جان تقریباً اڑھائی بجے دفتر سے گھر آئے۔ دونوں اپنے پرس لیے گاڑی میں بازار کی طرف روانہ ہو گئیں۔ گاڑی فائزہ چلا رہی تھی۔ دونوں آدھ گھنٹے بعد بازار میں ایک کپڑے کی دکان میں ملتانی گرم شالیں دیکھ رہی تھیں۔

"بھائی صاحب، وہ کالی شال دکھایئے" فائزہ بولی۔

"اچھا باجی" دکان دار بولا۔

"صائمہ بتاؤ کون سی شال اچھی رہے گی؟"

"یہ نیلی شال بہت خوب صورت ہے"۔

"چلو پھر یہی لے لیتے ہیں" فائزہ نے کہا۔

انہوں نے بھاؤ تاؤ کے بعد نیلی شال 250 روپے میں خرید لی۔ اب دونوں کا رخ چوڑیوں کی دکان کی طرف تھا۔ انہوں نے رنگ برنگی چوڑیوں میں سے سنہری چوڑیوں کا انتخاب کیا۔ چوڑیاں خریدنے کے بعد صائمہ نے اپنے لیے کچھ چیزیں خریدیں۔ بازار میں انہیں 4 بج گئے تھے۔ دونوں خریداری کے بعد کار پارکنگ کی طرف بڑھیں۔ گاڑی دیکھ کر فائزہ کو چابیوں کا خیال آیا۔

"چابیاں کہاں گئیں؟" یہ کہتے ہوئے فائزہ نے اپنا پرس دیکھا۔ چابیوں کا گچھا اس میں نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کے اندر جھانکا کہ کہیں جاتے ہوئے چابیاں اندر نہ رہ گئی ہوں۔ چابیوں کا گچھا وہاں بھی نہ تھا۔ فائزہ نے دوبارہ پرس کی ساری چیزیں نکال کر چابیاں تلاش کیں مگر چابیاں پرس میں ہوتیں تو ملتیں۔

"تم نے کہاں رکھی تھیں؟" صائمہ نے پوچھا۔

"مجھے کچھ یاد نہیں ہے، آؤ ان دکانوں میں چلیں جہاں سے ہم نے خریداری کی ہے۔ آ جاؤ ہمارے پاس وقت کم ہے"۔

پھر دونوں بازار میں واپس چلی گئیں۔ انہوں نے جس دکان دار سے بھی چابیوں کے بارے میں پوچھا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"صائمہ اب کیا ہو گا، 6 بجے ہماری پرواز ہے۔ اس وقت ساڑھے چار بج رہے ہیں، اب کیا کریں؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں" صائمہ نے افسردہ لہجے میں کہا۔

دونوں بازار آتے ہوئے جس قدر خوش تھیں اب

اسی قدر اداس اور پریشان نظر آ رہی تھیں۔ وہ گاڑی کے پاس واپس آئیں۔ اب نئی چابی بنوانے کے سوا مسئلے کا کوئی دوسرا حل نہ تھا۔ کار پارکنگ میں ٹوکن لگانے والے آدمی نے ایک لڑکے کو بھیج کر ایک چابی بنانے والے کاری گر کو بلوا دیا۔

"کاری گر بھیا' جلدی کرو ہمیں دیر ہو رہی ہے" صائمہ نے کہا۔

"بی بی جی ابھی چابی لگا دوں گا" اس نے کئی چابیاں تالے کو کھولنے کے لیے لگائیں۔ دونوں بار بار گھڑی کو دیکھ رہی تھیں۔ فائزہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر چابیوں کا گچھا کہاں چلا گیا ہے۔

"بھیا اتنی دیر مت لگاؤ' جلدی چابی لگا دو" فائزہ بولی۔

"بی بی جی چابی ہی لگا رہا ہوں۔ اب کوئی چابی فٹ نہیں بیٹھ رہی تو میں کیا کروں" کاری گر بولا۔

"تم مجھے اناڑی لگتے ہو" فائزہ غصہ بھرے لہجے میں بولی۔

"بی بی جی دس سال سے یہ کام کر رہا ہوں"۔

"زیادہ باتیں مت بناؤ صرف کام کرو"۔

"فائزہ غصہ مت کرو بے چارہ کام تو کر رہا ہے" صائمہ بولی۔

"خاک کام کر رہا ہے' پرواز کا وقت ہونے والا ہے"۔

"وقت ہونے والا نہیں بلکہ ہو چکا ہے۔ کیوں کہ اس وقت پانچ بج رہے ہیں۔ اب ہم کسی صورت بھی 6 بجے تک ہوائی اڈے پر نہیں پہنچ سکتیں"۔ صائمہ نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔

"اوہ میرے خدایا! چابیوں نے بھی آج ہی گم ہونا تھا' سارے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا ہے"۔

فائزہ کی بات سن کر صائمہ نے ناخوش گوار لہجے میں اسے گھورا' جیسے کہ رہی ہو کہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔

کاری گر کی محنت رنگ لائی۔ آخر وہ ایک چابی سے کار کا دروازہ کھولنے میں کام یاب ہو گیا۔ اس نے ریتی کے ساتھ چابی کو رگڑا اور گاڑی میں لگا دی۔ گاڑی فوراً اسٹارٹ ہو گئی۔ انہوں نے کاری گر کی مزدوری ادا کی۔ اس سے پہلے کہ وہ گاڑی میں سوار ہو کر وہاں سے جاتیں' چوڑیوں کی دکان میں کام کرنے والا دس گیارہ سال کا ایک لڑکا ان کے پاس آیا۔ اس کی اڑی ہوئی رنگت اور پھولے ہوئے سانس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ بھاگتا ہوا آیا ہے۔

"باجی جی... باجی جی رکیے" بچہ بمشکل کہ پایا۔

"کیا بات ہے؟" فائزہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"باجی جی چابیوں کا گچھا آپ کو دینے آیا ہوں"

بچے نے جب چابیوں کا گچھا فائزہ کے ہاتھ میں تھمایا تو اس نے پوچھا "یہ کہاں سے ملا ہے؟"

"وہ جی' یہ گچھا سنہری چوڑیوں کے ڈبے میں پڑا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے استاد جی ایک عورت کو سنہری چوڑیاں دکھانے لگے تو انہیں یہ چابیاں ملیں' انہوں نے کار پارکنگ کی طرف مجھے دوڑایا کہ آپ کی امانت آپ کے حوالے کر آؤں۔ اللہ کا شکر ہے کہ آپ مل گئیں۔ اچھا باجی جی میں چلتا ہوں"

دونوں نے بچے کا شکریہ ادا کیا۔ اور بچے کے وہاں سے جاتے ہی فائزہ نے صائمہ کو مخاطب کیا "میں اس بار یہ نہیں پوچھوں گی کہ سنہری چوڑیوں کے ڈبے میں چابیوں کا گچھا کیسے پہنچا تھا"۔

"ایسا میری لاپروائی کی وجہ سے ہوا ہے"۔

یہ الفاظ سن کر صائمہ کے افسردہ اور پریشان چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے چابیوں کے گچھے میں اس سنہری چابی کی طرف دیکھا جس سے گاڑی اسٹارٹ ہوتی تھی۔ اس سنہری چابی کے گم ہونے نے فائزہ کی زبان سے اس بات کا اقرار کروا لیا تھا جس کا وہ ہمیشہ انکار کرتی رہی تھی۔ فائزہ نے بغیر کچھ کہے اب کی بار سنہری چابی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے گھر جانے والی سڑک پر ڈال دیا۔

Sharjeel Ahmed

شاہد
ریاض
شاہد

برفانی انسان

سلیم خاں گمی

Sharjeel Ahmed

مجھے لندن سے خط آیا تھا۔ لیکن یہ خط کافی دیر سے ملا تھا۔ اسے 14 اگست کو سپرد ڈاک کیا گیا لیکن اس کا پتا غلط تھا' یہ ریڈیو پاکستان لاہور کے پتے پر ارسال کیا گیا تھا حال آں کہ میں پاکستان براڈ کاسٹنگ اکیڈمی اسلام آباد میں تھا۔ لاہور سے یہ خط ریڈیو پاکستان اسکردو بھیجا گیا۔
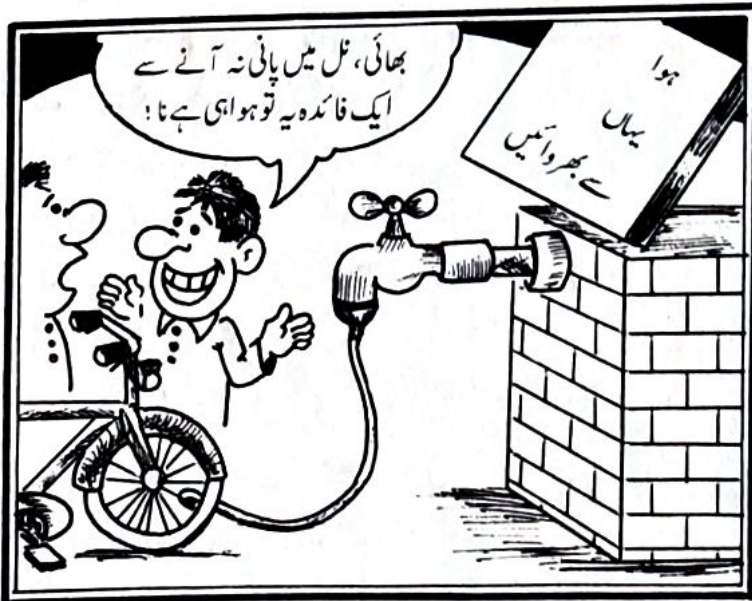
کیوں کہ جس کلرک نے اسے نیا پتا لکھ کر اسکردو بھیجا تھا اس کو یہی معلوم تھا کہ میں ریڈیو پاکستان اسکردو کا اسٹیشن ڈائریکٹر ہوں' حال آں کہ میں وہاں سے ایک سال کے بعد تبدیل ہو کر واپس آگیا تھا۔ اسکردو سے یہ خط اسلام آباد آیا تو میں نے اسے پڑھا اور اس کا جواب لکھ کر بھیجا۔

خط میں لارڈ سپریڈی نے لکھا تھا کہ وہ بلتستان آکر برفانی انسان پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں اور اگر بلتستان میں برفانی انسان جس کو یتی "کہا" جاتا ہے' نظر آئے تو وہ اسے بخوشی دیکھیں گے اور اگر وہ اسے پکڑ سکے تو پکڑیں گے نیز انھوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ وہ پچھلے سال نیپال اور بھوٹان کا دورہ کر چکے ہیں اور انہوں نے اس سلسلے میں کافی معلومات حاصل کی ہیں۔ وہ برفانی انسان کی تصویریں لینے کے لیے فوٹوگرافی کا سامان اور کیمرے بھی ساتھ لائیں گے۔ لارڈ سپریڈی نے آخر میں لکھا تھا کہ ہمارے ساتھ ہمارا اسٹاف بھی ہو گا یعنی ایک کیمرہ مین' ایک خادم' ایک خادمہ' ان کا بچہ اور ایک باورچی۔ آخری فقرہ یہ تھا کہ لیڈی سپریڈی بھی ساتھ ہو گی۔

لارڈ سپریڈی سے میرا تعارف لندن میں ہوا تھا۔ میں

بی بی سی لندن میں ریڈیو پروگراموں کی منصوبہ بندی اور پیش کش کی تربیت کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ سارا انتظام برطانوی کونسل نے کیا تھا۔ روپیہ پیسہ برطانیہ کی تکنیکی امداد کی وزارت نے دیا تھا۔ ہماری تربیت گاہ کا انتظام جارج میری کے ہاتھ میں تھا۔ ہماری سے مراد ہے کہ میرے علاوہ دولت مشترکہ کے چھ دوسرے پروگرام پروڈیوسر بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک روز جارج میری ہمیں لارڈ سپریڈی کے فارم پر لے گئے اور ہم نے ان کے گھوڑے' گائیں' بھینسیں اور مینڈھے دیکھے اور ان پر دستاویزی پروگرام بنایا۔ ان کے پاس سفید چوہے سے لے کر کالے ہاتھی تک دنیا جہان کے جانور تھے جو ایک لمبے چوڑے فارم پر پل رہے تھے۔ جن کی دیکھ بھال کے لیے باقاعدہ عملہ بھرتی کیا گیا تھا۔ ہم نے دوپہر کو وہاں کھانا کھایا تھا۔ اب جو لارڈ سپریڈی کا خط مجھے ملا اس میں میرے استاد جارج میری کا سفارشی رقعہ بھی تھا۔ اس میں لکھا تھا کہ لارڈ سپریڈی اور لیڈی سپریڈی برفانی انسان پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ یہ کتاب تب مکمل ہو گی جب وہ بلتستان کا دورہ کریں گے اور اگر وہاں برفانی انسان ملا تو اسے دیکھ کر اس کی تصویریں لیں گے اور اگر اس کو پکڑ سکے تو پکڑ کر لندن لے آئیں گے۔ ہو سکتا ہے وہ برفانی انسان کو زندہ نہ پکڑ سکیں۔ اس کو شکار کر لیں کیونکہ لارڈ سپریڈی شکاری بھی ہے۔

میں خط پڑھ کر بہت گھبرایا۔ ایک یہ کہ مجھے کم سے کم پندرہ دن کی رخصت لینا ہو گی' دوسرے یہ کہ ان کی آمدورفت کا انتظام کرنا ہو گا' تیسرے ان کے قیام و طعام کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہو گی' چوتھے یہ کہ اگر برفانی انسان مل گیا تو اس کی تصویر کشی کے لیے نہایت اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کی سفید براق چوٹیوں پر جانا ہو گا۔ اگر برفانی انسان نے اپنی جان بچانے کے لیے الٹا حملہ کر دیا تو کیا ہو گا؟

جی چاہا کہ لکھ دوں کہ نہ آئیں۔ لیکن میں نے تو لندن کے قریب لارڈ سپریڈی کے فارم پر ان سے کہا تھا کہ اگر وہ کبھی پاکستان تشریف لائیں تو میں ان کی میزبانی کے لیے حاضر ہوں۔ اب اگر انکار کرتا تو وعدہ خلافی ہوتی۔ چنانچہ میں نے لارڈ سپریڈی کو خط لکھا کہ وہ اپنی ٹیم کو ساتھ لے کر تشریف لے آئیں۔

ستمبر میں مجھے لارڈ سپریڈی کی طرف سے ایک اور خط ملا کہ وہ نومبر کے پہلے ہفتے میں اسلام آباد آجائیں گے اور ان کی ٹیم ان کے ساتھ ہو گی۔ اسلام آباد میں ہر درجہ کے ہوٹل اور موٹل ملتے ہیں۔ مہنگے بھی اور سستے بھی۔ ایسے ہوٹل بھی جو پاکستانی کھانے پیش کرتے ہیں اور ایسے ہوٹل بھی جہاں ولائتی کھانوں کا انتظام ہوتا ہے۔ میں نے ایک ایسا ہوٹل لیا جو نہ بہت مہنگا تھا اور نہ ہی بہت سستا اور جہاں دونوں قسم کے کھانے ملتے تھے۔

نومبر کے پہلے ہفتے لارڈ سپریڈی اور ان کی ٹیم آگئی۔ ٹیم میں وہی لوگ تھے جن کے بارے میں انہوں نے لکھا تھا۔ ہاں ایک آدمی زائد تھا اور وہ ان کا سیکورٹی گارڈ تھا جو انگریز تھا اور فوج سے صوبے دار ریٹائر ہوا تھا۔ اسے لندن سے پاکستان کی پرائیویٹ سیکورٹی ایجنسی نے بک کیا تھا اور وہ اس سے پہلے ایک اہم پاکستانی شخصیت کا محافظ رہ چکا تھا۔

اسکردو میں ایک ہی کام کا ہوٹل ہے جہاں کوہ پیما ٹیمیں اترتی رہتی ہیں۔ یہ ٹیمیں بیرونی ممالک سے آتی ہیں۔ اس لیے ہوٹل کی انتظامیہ دوسرے ملکوں کے مہمانوں کے رہنے سہنے اور کھانے کا معقول انتظام کرنے کی ماہر ہے۔ میں اسکردو فون کر کے سات افراد کی بکنگ کروا چکا تھا لیکن ابھی تاریخ پکی نہ کی تھی۔ جب لارڈ سپریڈی کی ٹیم آئی تو وہ واقعی سات تھے۔ لارڈ سپریڈی' لیڈی سپریڈی' لارڈ کا خادم' لیڈی کی خادمہ' کیمرہ مین' باڈی گارڈ اور لارڈ کا بیٹا جس کی عمر سات سال تھی۔ مجھے بھی ان کے ساتھ جانا تھا لیکن میرے ٹھہرنے کا انتظام اسکردو کی ریڈیو کالونی کے مہمان خانے میں تھا۔ بلتستان میں سڑکیں ایسی نہیں ہیں جیسی کراچی' کوئٹہ' لاہور یا پشاور میں ہیں۔ یہ سڑکیں جیپ ایبل ہیں یعنی ان پر جیپ ہی چل سکتی ہے۔ چناں چہ لارڈ کے مشورے سے تین جیپیں کرائے پر لی گئیں۔ البتہ ان کو کرائے پر لینے کی تاریخ

ابھی پکی نہ کی تھی۔

چکلالہ کے ہوائی اڈے سے اسکردو کی پرواز صبح سویرے جاتی ہے۔ سارا سفر ستر منٹ کا ہے۔ راستہ میں آزاد کشمیر اور نانگا پربت آتے ہیں۔ آزاد کشمیر کا دریائے نیلم اور دریائے سندھ دکھائی دیتے ہیں۔ اسکردو کا ہوائی اڈہ بھی دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر ہے۔ جب ہم نومبر کے پہلے ہفتے اسکردو ہوائی اڈے پر پہنچے تو تینوں جیپیں جن کو کرایہ پر اٹھا رکھا تھا، موجود تھیں۔ ان میں بیٹھ کر لارڈ پارٹی ہوٹل میں پہنچ گئی اور میں اسٹیشن ڈائریکٹر کی جیپ میں ریڈیو پاکستان کے مہمان خانے میں چلا گیا۔ طے پایا کہ برفانی انسان کو دیکھنے کے لیے اسی دن شام کو ہوٹل میں لارڈ سپریڈی سے ملاقات ہو گی۔

"ہمیں پولیس کو اطلاع دینا ہو گی کہ آپ اور آپ کی ٹیم بلتستان میں آئی ہوئی ہے" میں نے لارڈ سے کہا۔

"ہاں، یہ ضروری ہے۔ ہماری ٹیم کو کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے۔ ایسی صورت میں پولیس کہہ سکتی ہے کہ ہمیں پیشگی اطلاع نہ تھی" لارڈ نے کہا۔

"خفیہ پولیس کو تو اطلاع ہو گئی ہو گی۔ اسلام آباد سے ان کو چٹھی آگئی ہو گی" میں نے کہا۔

"اگر اعلیٰ پولیس افسر کو مطلع کر دیا جائے تو وہ اپنے خفیہ ونگ کو بھی مطلع کر دیں گے۔ ہاں، ڈپٹی کمشنر کو اطلاع کرنا ضروری ہے" لارڈ بولا۔

"میں ان سے کل وقت لے کر آپ کو اطلاع کر دوں گا" میں نے کہا۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا" لارڈ خوش ہو کر بولا۔

ہم باتیں کر رہے تھے کہ لیڈی سپریڈی اپنے بچے کے ساتھ اندر آئی۔ وہ باہر سبزہ زار میں بچے کے ساتھ سیر کر رہی تھی۔ لیڈی سپریڈی کی عمر 30 سال تھی جب کہ لارڈ کی عمر پچاس سال ہو گی۔ ان کے بچے کی عمر سات آٹھ سال ہو گی اور وہ گورا چٹا سنگ مرمر کا تراشا ہوا مجسمہ نظر آتا تھا۔ اس کا نام فلیپ تھا۔

"ہمیں بچے کو سردی سے بچانا ہو گا" میں نے کہا۔

"یقیناً، لیکن فلیپ بہادر ماں کا بہادر بچہ ہے۔ ڈسپلن کا بہت پابند ہے۔ والدین کی ہر بات توجہ سے سنتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ دن بھر کا پروگرام ایک دن پہلے بناتا ہے اور پروگرام بنانے سے پہلے اپنی ماں سے یا کبھی کبھی مجھ سے مشورہ ضرور کرتا ہے۔ ورزش کرتا ہے۔ کھانے پینے میں احتیاط سے کام لیتا ہے۔ یہ نہیں کہ جو چیز سامنے آئی ہڑپ"۔

یہ سن کر فلیپ زور سے ہنسا اور ماں کو لے کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے دن ہم نے ڈپٹی کمشنر اسکردو سے ملاقات کی۔ وہیں ایس ایس پی مل گئے۔ چائے پی اور واپس آگئے۔ اس کے بعد ہوٹل آئے اور پھر اسکردو کا پرانا قلعہ دیکھنے چلے گئے۔ لیڈی سپریڈی اور فلیپ بھی ہمارے ساتھ تھے۔

دوسرے دن ہم صبح سویرے جیپوں میں بیٹھ کر روانہ

ہوئے۔ اوپر پہاڑوں پر رات برف باری ہوئی تھی اس لیے ان کی چوٹیاں برف سے یوں لدی پھندی تھیں جیسے روئی بھری گاڑیاں کھڑی ہوں۔

دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہم خپلو پہنچے۔ وہاں سے چائے پی اور پھر چھوربٹ کے علاقہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اب بھی ہمارا سفر دریائے سندھ کے معاون دریا کے ساتھ ساتھ تھا۔ سڑک پتھروں سے اٹی ہوئی تھی اس لیے جیپوں کو آہستہ آہستہ لے جانا پڑا۔ شام سے پہلے ہم پیون کی چھوٹی سی چھاؤنی میں پہنچ گئے۔ جہاں ہمارے لیے رات گزارنے کا انتظام کیا گیا تھا۔

پیون میں رات بھر برف باری ہوتی رہی اور جب صبح ہوئی تو بند ہو گئی۔ ہر طرف برف باری سے سفیدی نظر آتی تھی۔ راستے بھی برف سے اٹے ہوئے تھے۔ جب برف باری ہوتی ہے تو سردی کی لہر رک جاتی ہے لیکن جب برف باری رک جائے تو سردی کی لہر تندو تیز ہو جاتی ہے۔ یہی ہوا۔ رات سردی زیادہ نہ تھی لیکن دن کو سردی تیز ہو گئی۔ چاروں طرف ملگجے پہاڑ تھے۔ پہاڑوں کے نیچے پہاڑیاں تھیں۔ پہاڑیوں کے نیچے بڑے بڑے پتھر تھے۔ پھر چھوٹے پتھر اور آخر میں روڑے تھے جو رستوں میں بکھرے پڑے تھے۔ پہاڑ سے لے کر روڑوں تک سب برف آلود تھے۔ البتہ سورج کی گرمی سے اب برف پگھل رہی تھی۔

دوسرے دن ہماری ٹیم اسلام پوسٹ پہنچی۔ اس پوسٹ کا انچارج ایک لمبا تڑنگا جوان تھا جس کا عہدہ کپتان کا تھا۔ وہ ہمیں مل کر بہت خوش ہوا اور اس نے ہمیں اپنے جوانوں سے ملوایا جو تعداد میں چار تھے۔ اس نے ہمیں قہوہ بھی پلایا۔

"بلتستان میں یہ ہماری آخری فوجی چوکی ہے" کپتان نے بتایا

"اس کے بعد وہ علاقہ ہو گا جو نہ پاکستان کا ہے اور نہ بھارت کا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں' اسے نومین لینڈ کہتے ہیں۔ وہاں نہ بھارتی سینا (فوج) آتی جاتی ہے اور نہ ہی ہم آتے جاتے ہیں" وہ بولا۔

"نومین لینڈ کے بعد کون سا علاقہ شروع ہوتا ہے؟" لارڈ نے پوچھا۔

"اس کے بعد لداخ کا علاقہ شروع ہو جاتا ہے اور دونوں ملکوں کے درمیان لائن آف کنٹرول ہے" کپتان نے بتایا۔

"ہاں یہ تو میں جانتا ہوں۔ بلتستان اور لداخ کے درمیان انٹرنیشنل بارڈر نہیں ہے۔ جنگ بندی کی عارضی حد یا لائن ہے" لارڈ سپریڈی بولا۔

"آپ لندن سے اتنی دور کیا کرنے آئے ہیں' کوہ پیمائی یا سیر و تفریح؟" کپتان نے سوال کیا۔

"میں برفانی انسان پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ انڈیا' نیپال اور بھوٹان جا چکا ہوں' لیکن میں نے سوچا اگر میں بلتستان نہ گیا تو کتاب مکمل نہ ہو گی۔ کیوں کہ بلتستان میں برفانی انسان کی موجودگی کے آثار پائے جاتے ہیں" لارڈ نے بتایا۔

"سچی بات یہ ہے کہ ہم نے آج تک برفانی انسان نہیں دیکھا۔ ہاں سنا ضرور ہے کہ ان پہاڑوں میں کہیں برفانی انسان رہتا ہے۔ آج آپ نے بھی بتایا ہے کہ ان پہاڑوں میں برفانی انسان کے آثار موجود ہیں"۔

برفانی انسان کے متعلق دنیا کے کچھ سائنس دان کہتے ہیں کہ یہ ایک وہم کا نام ہے۔ کچھ سائنس دان کہتے ہیں کہ برفانی انسان واقعی پایا جاتا ہے۔ اس کا قد چھ' پونے چھ فٹ ہوتا ہے۔ ہتھیلیوں اور تلوؤں پر بال نہیں ہوتے۔ باقی سارا جسم بالوں میں چھپا ہوتا ہے' بالکل ریچھ کی طرح یعنی برفانی ریچھ کی طرح"

"کہیں وہ برفانی ریچھ ہی نہ ہو" میں نے کہا۔

"نہیں' برفانی ریچھ نہیں' ہے وہ انسان۔ لیکن برفانی انسان وہیں رہتا ہے جہاں سارا سال برف پڑتی ہو اور سارا سال جمی بھی رہتی ہو"۔

"اس لحاظ سے بلتستان کا یہ علاقہ برفانی انسان کے

لیے موزوں اور مناسب ہے اور وہ اسی موسم میں یعنی نومبر دسمبر اور جنوری میں خوب گھومتا پھرتا ہے۔ کیونکہ برفانی آب و ہوا کی وجہ سے اس علاقے کی بستیاں خالی ہو جاتی ہیں۔ لوگ یا تو چھوڑ کر چلے جاتے ہیں یا اپنے گھروں کے نیچے بنائے ہوئے تہ خانوں میں چلے جاتے ہیں۔ پھر برفانی انسان اپنی مرضی کے مطابق ان بستیوں کا رخ کرتے ہیں۔ وجہ ایک اور بھی ہے۔ برفانی انسان گوشت خور ہے۔ وہ خرگوش، لومڑی، گیدڑ، ہرن اور بارہ سنگھا کو شکار کرتا ہے۔ یہ جانور اوپر پہاڑوں سے اتر کر بستیوں کی طرف آجاتے ہیں۔ برفانی انسان ان کو بھی شکار کرنے کے لیے آبادیوں اور دیہات میں یعنی نیچے چلا آتا ہے۔

"کیا وہ انسان کا شکار بھی کرتا ہے؟" میں نے لارڈ سے پوچھا۔

"نہیں، انسان کا شکار نہیں کرتا بلکہ اس سے ڈرتا ہے۔ البتہ اگر اسے اپنی زندگی بچانے کے لیے کسی انسان کا مقابلہ کرنا پڑے تو پھر چوکتا نہیں۔ حملہ کرتا ہے اور پھاڑ ڈالتا ہے"۔

وقت کافی ہو گیا تھا اس لیے ہم نے کپتان سے اجازت لی اور ان کا شکریہ ادا کیا اور قریب کے ایک گاؤں فرانو چلے گئے۔ فرانو کے نمبردار محمد حسین کو ڈپٹی کمشنر کے آفس سے اطلاع مل چکی تھی۔ اس نے ہماری رہائش کا انتظام کر رکھا تھا۔ سارا گاؤں اداس دکھائی دیتا تھا۔ لگتا تھا لوگ گھبرائے ہوئے ہیں۔ نومبر شروع ہو چکا تھا اس لیے کسانوں نے اپنے تمام مویشی آزاد کر دیئے تھے۔ یعنی ان کے رسے ان کی گردنوں اور سینگوں کے گرد لپیٹ کر ان کو باہر جنگل اور پہاڑوں کی طرف ہانک دیا تھا۔ اب وہ ان کو مارچ میں تلاش کر کے گھروں میں لائیں گے۔

شام کو لوگ تہ خانوں میں چلے گئے۔ وہ بھیڑیں اور بکریاں بھی ساتھ لے گئے۔ نمبردار محمد حسین کے اہل خانہ تہ خانہ میں چلے گئے اور اپنی بھیڑیں اور بکریاں بھی لے گئے۔ گھر کے ایک مکان میں لارڈ، لیڈی اور فلیپ سو گئے اور دوسرے میں باقی تمام مرد فرش پر بستر لگا کر لیٹ گئے۔ رات بارہ بجے تک نیند نہ آئی، اس کے بعد خوب نیند آئی۔

ابھی سورج نہ نکلا تھا کہ لارڈ اور لیڈی بھاگے بھاگے ہمارے کمرے میں آئے۔ وہ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔

"کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا بیٹا فلیپ" لارڈ گھبرا کر بولا۔

کیا ہوا فلیپ کو؟" میں نے پوچھا۔

"اسے برفانی انسان رات لے گیا، اغوا کر کے"

"اغوا کر کے؟ سر، یہ آپ کیا کہ رہے ہیں؟" میں نے کہا۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ کمرے کے باہر اس کے پیروں کے نشان ہیں۔ بڑے بڑے قدموں کے نشان، آؤ دیکھو"۔

ہم سب یعنی سیکورٹی گارڈ، کیمرہ مین۔ خادم، خادمہ اور تینوں جیپ ڈرائیور کمرے سے باہر نکلے۔ برف پر بڑے بڑے قدموں کے نشان تھے۔ چناں چہ لارڈ، میں اور سیکورٹی گارڈ قدموں کے نشانوں پر چل پڑے۔

ہمارے سامنے برف سے اٹے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں سے پہلے برف پوش پہاڑی تھی۔ پہاڑی کے پہلو میں دریائے سندھ کا معاون دریا بہ رہا تھا۔ لیکن اس کی اوپر کی سطح جم چکی تھی اور سخت ہو گئی تھی۔ ہم دریا عبور کر کے پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ لارڈ پہاڑی پر چڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ایک غار نظر آیا۔ وہ سیکورٹی گارڈ کو لے کر غار کے اندر گیا۔ یہ ایک لمبا غار تھا۔ اس کے وسط میں برفانی انسان لیٹا ہوا تھا۔

"برفانی انسان" لارڈ کے منہ سے نکلا۔ سیکورٹی گارڈ نے ڈرتے ڈرتے گولی چلائی۔ اس کا ہاتھ کانپا، گولی غار کی چھت سے ٹکرائی اور اس کی گونج نے غار کو سر پر اٹھالیا۔

برفانی انسان اٹھ بیٹھا۔ ہم سب بہت حیران ہوئے۔ لیکن کیا؟ یہ برفانی انسان تو نہ تھا۔ یہ تو فلیپ تھا اور وہ اٹلی کے بنے ہوئے لمبے لمبے مٹیالے بالوں والا کمبل اپنے جسم کے اردگرد لپیٹے ہوئے تھا۔ یہی کمبل لے کر وہ رات سویا تھا

اور برفانی انسان اسے کمبل سمیت اٹھا کر لے آیا تھا۔

اس روز تو ہم فلیپ کو وہاں سے اٹھا لائے لیکن لارڈ ساری رات سو نہ سکا۔ اس کی زندگی بھر کی خواہش تھی کہ وہ برفانی انسان کا شکار کرے، زندہ یا مردہ۔ مگر اس کی یہ خواہش خاک میں مل گئی تھی۔ الٹا وہ ایک طرح سے اپنا اکلوتا بیٹا گنوا بیٹھا تھا۔ یہ تو خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم تھا کہ اس کا بیٹا اسے زندہ مل گیا۔

لیڈی سپریڈی چاہتی تھی کہ وہ جلد سے جلد فرانو کیا بلتستان سے نکل جائیں۔

شدید برف باری شروع ہو گئی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے رہتے لیکن بارش نہ ہو پاتی۔ بادلوں کو تندو تیز ہوائیں کبھی اڑا کر لے جاتیں کبھی گھیر کر لے آتیں۔ اس لیے اس نے اپنے شوہر کو فرانو سے روانگی کی درخواست کی تھی لیکن وہ نہ مانا۔

وہ دوسرے دن اپنے باڈی گارڈ کو لے کر برفانی انسان کی تلاش میں چل پڑا۔ مجھے مجبوراً ساتھ جانا پڑا کہ وہ میرے مہمان تھے۔ ہم تینوں صبح سویرے سخت سردی میں اسی غار میں پہنچے جہاں سے ایک دن پہلے ہم فلیپ کو لائے تھے۔ غار خالی تھا۔ وہاں نہ برفانی انسان تھا نہ اس کا نام نشان۔ لارڈ نے غار کا پورا چکر لگایا اور پھر ایک جگہ کھڑا ہو کر غار کو اندر سے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔

ہم غار کے اندر بالکل غار کے منہ کے قریب کمبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ لارڈ کا باڈی گارڈ بندوق لے کر اور چوکس ہو کر غار کے منہ میں بیٹھ کر باہر دیکھنے لگا۔ اچانک برف باری میں اسے دور برفانی انسان نظر آیا۔ اس کا قد تقریباً چھ فٹ تھا، ہاتھ ٹخنوں کو چھو رہے تھے۔ اور وہ ڈگ بھرتا ہوا غار کی طرف آرہا تھا۔ برف باری میں وہ صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ اچانک برفانی مگر انسان پلٹ کر برف میں بھاگنے لگا اور آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ شاید اس نے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ ہم واپس لوٹ آئے۔ لارڈ آج بہت خوش تھا کہ اس نے برفانی انسان دیکھ لیا تھا۔

دوسرے دن جب ہم دوبارہ گئے تو بھی غار خالی تھا۔ ہم غار کے اندر گھومتے رہے۔ اس کی محرابی دیواروں اور گول چھت کو گھورتے رہے۔ آخر کار کمبل بچھا کر غار کے آخری تاریک کونے میں چھپ کر بیٹھ گئے کہ برفانی انسان غار خالی دیکھ کر اندر آجائے اور ہم اسے پکڑ لیں یا گولی کا نشانہ بنائیں۔ مگر وہ نہ آیا۔

آخر کار ہم مایوس واپس لوٹ آئے۔ نہ برفانی انسان پکڑا گیا اور نہ ہی لارڈ کی کتاب چھپ سکی۔ سنا ہے اگلے سال لارڈ پھر بلتستان کا دورہ کرے گا اور برفانی انسان کو پکڑنے کی کوشش کرے گا۔

ایک مکھی اپنے بیٹے کے ساتھ کسی گنجے کے سر پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ "دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی ہیں" اس نے اپنے بیٹے سے کہا۔
"وہ کیسے ممی؟" صاحب زادے نے دریافت کیا۔
"میں جب تمہاری عمر کی تھی تو یہاں صرف فٹ پاتھ ہوا کرتا تھا" مکھی نے جواب دیا (محمد آصف مرزا چیچہ وطنی)

غریب مریض: ڈاکٹر صاحب، میں بہت غریب ہوں میری فیس معاف کر دیجئے۔ آپ کے کام آؤں گا۔
ڈاکٹر: تم کام کیا کرتے ہو؟
مریض: حضور میں قبریں کھودتا ہوں (عمران بشیر لاہور)

ایک دوست (دوسرے دوست سے): کاش میں وقت ہوتا، لوگ میری قدر کرتے۔ ہر شخص میرا غلام ہوتا۔ لوگ میرے پیچھے بھاگتے لیکن میں کسی کے ہاتھ نہ آتا۔
دوسرا دوست: اگر تم وقت ہوتے تو لوگ اپنے گھروں کی کھڑکیاں دروازے بند کر لیتے۔
پہلا دوست: وہ کیوں؟
دوسرا دوست: لوگ کہتے "بھائی ہٹ جاؤ، کتنا برا وقت آ رہا ہے"
(قمروانی رکن سٹی)

مسافر: کیا اس ہوٹل کا باورچی بدل گیا ہے۔
بیرا: جی ہاں، لیکن آپ کو کس نے بتایا؟
مسافر: کسی نے نہیں، آج سالن سے سفید بال نکلے ہیں پہلے سیاہ نکلا کرتے تھے۔ (ناصر نسیم، چینوٹ)

لکڑ ہارا اپنے کم عمر لڑکے کے ساتھ جنگل میں گیا، لکڑیاں کاٹتے ہوئے شام ہو گئی۔ تھکن سے برا حال تھا۔ واپسی پر راستہ بھول گیا۔ بہت تلاش کے بعد جب راستہ نہ ملا تو غصے سے اپنے بیٹے کو پیٹنا شروع کر دیا اور بولا "نامعقول، میں تو راستہ بھول گیا ہوں تو تو گھر جا، تیری ماں تیرا انتظار کر رہی ہو گی (خولہ نواز راول پنڈی)

ایک ڈاکٹر (جو اسمبلی کا امیدوار تھا) اپنے حلقے کی غریب آبادی میں تقریر کرتے ہوئے ان سے خوب وعدے کر رہا تھا۔ سامعین میں سے ایک بے باک آدمی بولا "ڈاکٹر صاحب، سنا ہے آپ بہت مغرور ہیں"۔
ڈاکٹر بولا: کون کہتا ہے کہ میں مغرور ہوں۔ اگر میں مغرور ہوتا تو آپ جیسے ٹکے ٹکے کے لوگوں سے ووٹ مانگتا؟
(خلیل زینب قادر سوات)

دادی (پوتے سے): بتاؤ تمہیں کس نے مارا ہے؟ میں اسے کچا چبا جاؤں گی۔
پوتا: مگر دادی جان، آپ کے تو دانت ہی نہیں ہیں
(صائمہ عبدالحئی حضرو)

کھیلوں کی دنیا

ماضی کے چند فاسٹ بائولر

ابن الطاف

Sharjeel Ahmed

سرفراز نواز (پاکستان)

سرفراز نواز یکم دسمبر 1948ء کو لاہور میں پیدا ہوئے انہوں نے 1967ء میں فرسٹ کلاس کیرئیر کا آغاز کیا اور پھر انہوں نے 1968-69ء میں انگلینڈ کے خلاف کراچی ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیرئر کا آغاز کیا۔ ان کی جوڑی عمران خان کے ساتھ بہت مشہور ہوئی۔ 1979ء میں پاکستان نے آسٹریلیا کے خلاف میلبورن میں ہارا ہوا میچ سرفراز کی بدولت جیتا آسٹریلیا کو میچ جیتنے کے لیے 77 رنز درکار تھے اور اس کی 7 وکٹیں باقی تھیں مگر سرفراز نواز نے آخری 7 وکٹیں صرف 1 رنز دے کر حاصل کیں اور اننگ میں 9/86 کی یادگار اننگ کھیلی۔ وہ ایک عمدہ فاسٹ بالر تھے جن کی وجہ سے پاکستان نے کئی میچوں میں فتح حاصل کی۔ 1984ء میں انگلینڈ کے خلاف لاہور ٹسٹ میں 49 رنز کے عوض 4 وکٹیں حاصل کیں اور 90 رنز کی خوب صورت اننگ کھیلی۔ انہیں تیسرے ایسے پاکستانی بالر ہونے کا اعزاز حاصل ہے جس نے ٹسٹ ڈبل کیا۔

ٹسٹ کیرئر: 55 ٹسٹ' 72 اننگز 13 مرتبہ ناٹ آؤٹ کل رنز 1045' اوسط 17.71' 4 نصف سنچریاں' بہترین سکور 90' 26 کیچز' 5798 رنز دے کر 177 وکٹیں' اوسط 32.75' بہترین بالنگ 9/86' اننگ میں 5 وکٹ 4 مرتبہ میچ میں 10 وکٹ ایک مرتبہ۔

ون ڈے کیرئیر: 45 میچ' 31 اننگز' 8 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 221 رنز' اوسط 9.60' 8 کیچز' 1463 رنز دے کر 63 وکٹیں' اوسط 23.22 رابرٹس بہترین بالنگ 4/24۔

اینڈی رابرٹس (ویسٹ انڈیز)

اینڈرس منٹگمری ایورٹن رابرٹس 29 جنوری 1951ء کو انیٹی گوا کے چھوٹے سے گاؤں ارنز میں پیدا ہوا۔ 1969-70 میں رابرٹس نے اپنے فرسٹ کلاس کیرئیر کا آغاز کیا اور پھر 1973-74ء میں رابرٹس نے انگلینڈ کے خلاف کنگسٹن ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیرئیر کا آغاز کیا۔ 1975-76 میں آسٹریلیا کے خلاف پرتھ ٹسٹ میں رابرٹس نے آسٹریلیا کی پہلی اننگ میں 2 وکٹ لینے کے بعد دوسری اننگ میں 14 اوورز میں 54 رنز دے کر 7 وکٹیں حاصل کیں۔

یہ ٹسٹ کرکٹ میں رابرٹس کی بہترین بالنگ ہے۔ 1983ء میں بھارت کے خلاف اپنی 200 ٹسٹ وکٹ مکمل کی اور پہلے ایسے ویسٹ انڈیز بالر بن گئے جس نے 200 وکٹ حاصل کی ہوں۔ اینڈی رابرٹس دنیا کا خطرناک ترین اور ناقابل فراموش قدرتی فاسٹ بالر تھا۔ رابرٹس نے 10 سال تک عالمی کرکٹ پر اپنی خوب صورت فاسٹ بالنگ کی وجہ سے حکومت کی۔

ٹسٹ کیرئیر= 47 ٹسٹ' 62 اننگز' 11 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 762 رنز' اوسط 14.94' 3 نصف سنچریاں' بہترین سکور 68' 11123 گیندیں' 378 میڈن اوورز' 5172 رنز کے عوض 202 وکٹیں' اوسط 25.60' اننگ میں 5 یا زائد وکٹیں 11 مرتبہ' میچ میں 10 یا زائد وکٹ 2 مرتبہ' بہترین بالننگ 7/54

ون ڈے کیرئر: 56 میچ' 32 اننگز' 9 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 233 رنز' اوسط 10.08' بہترین سکور 37' 6 کیچز' 87 وکٹیں' اوسط 19.82' اننگ میں 4 وکٹ 3 مرتبہ' بہترین بالنگ 5/22

مائیکل ہولڈنگ (ویسٹ انڈیز)

مائیکل انتھونی ہولڈنگ 16 فروری 1954ء کو کنگسٹن جمیکا میں پیدا ہوئے۔ 1972.73ء میں اپنے فرسٹ کلاس کیرئیر کا آغاز کیا اور

پھر 76-1975ء میں انگلینڈ کے خلاف برسبین ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیرئر کا آغاز کیا۔ 1976ء میں انگلینڈ کے خلاف اوول کی بے جان اور بیٹنگ وکٹ پر ہولڈنگ نے تباہی مچا دی اور میچ میں 14 وکٹ حاصل کئے۔ دونوں اننگز میں ہولڈنگ نے زبردست بالنگ کرواتے ہوئے 92/8 - 75/6 کی کارکردگی دکھائی۔ انہوں نے 4 ٹسٹ میچوں میں 28 وکٹ حاصل کئے۔ 190 سینٹی میٹر لمبے مائیکل ہولڈنگ کو اپنے طویل رن اپ کے باعث گیندیں تیز پھینکنے میں مدد ملتی تھی۔ انہوں نے اپنے کیرئیر میں بارہا 90 میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گیندیں کروائیں۔ انہیں اس کی زبردست کارکردگی کی وجہ سے "موت کی سرگوشی" کا خطاب دیا گیا کیونکہ وہ اتنی سبک رفتاری سے دوڑتے تھے کہ بعض اوقات امپائرز کو علم ہی نہ ہوتا کہ وہ کب آئے اور گیند کرا دی۔ اکثر اوقات بیٹسمین تو گیند کو دیکھ ہی نہ سکتے تھے اور بولڈ ہو جاتے۔

ٹسٹ کیرئیر: 60 ٹسٹ' 75 اننگز' 10 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 910 رنز' اوسط 13.78' 6 نصف سنچریاں' بہترین سکور 73' 22 کیچز' 249 وکٹ' اوسط 23.68' اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 13 مرتبہ' میچ میں 10 یا زائد وکٹ 2 مرتبہ' بہترین بالنگ 92/8

ون ڈے کیرئیر: 102 میچ' 282 رنز' بہترین سکور 64' 2 نصف سنچریاں' 5473 گیندیں' 3034 رنز دے کر 142 وکٹیں' اوسط 21.36' بہترین بالنگ 26/5' اننگ میں 4 یا زائد وکٹ 6 مرتبہ۔

راڈنی ہاگ (آسٹریلیا)

راڈنی میلکم ہاگ 5 مارچ 1951ء کو رچمنڈ دوڈول میں پیدا ہوئے۔ 1975.76ء میں اپنے فرسٹ کلاس کیرئیر کا آغاز کیا۔ 1978.79ء میں انگلینڈ کے خلاف برسبین ٹسٹ میں اپنے ٹسٹ کیرئیر کا آغاز کیا۔ راڈنی ہاگ انتہائی تیز بالر تھے ان کی آؤٹ سوئنگ اور ان سوئنگ جتنی خطرناک تھی اتنی ہی خطرناک وہ شارٹ پچ بھی کیا کرتے اور ایسے موقع پر موجود بیٹسمین کا ان سے بچنا مشکل ہوتا تھا۔ نئی گیند پر آؤٹ سوئنگ اور پرانی گیند پر ان کی آف کٹر بلے بازوں کے لیے مشکلات کا باعث بنتی تھی۔ انہوں نے اپنی پہلی ٹسٹ سیریز میں 12.85 کی اوسط سے 41 وکٹیں حاصل کیں۔ ان کی بہترین ٹسٹ بالنگ 74/6 ہے۔ وہ ایک مکمل فاسٹ بالر تھے بعد میں اپنی فٹ نس پرابلم کی وجہ سے وہ شہرت حاصل نہ کر سکے جس کے وہ حق دار تھے۔

ٹسٹ کیرئیر: 38 ٹسٹ' 58 اننگز' 13 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 439 رنز اوسط 9.75' ایک نصف سنچری' بہترین سکور 52' 7 کیچز' 123 وکٹ' اوسط 28.24' اننگ میں 5 یا زائد وکٹ 6 مرتبہ میچ میں 10 یا زائد وکٹ 2 مرتبہ' بہترین بالنگ 64/6۔

ون ڈے کیرئیر: 70 میچ' 35 اننگز' 20 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 137 رنز' اوسط 9.13 بہترین سکور 22' 8 کیچز' 35 وکٹیں' اوسط 28.44 اننگ میں 4 وکٹ 5 مرتبہ' بہترین بالنگ 29/4۔

کپل دیو (بھارت)

کپل دیو 6 جنوری 1959ء کو چندی گڑھ ہریانہ میں پیدا ہوئے۔ 1975.76 میں اپنے فرسٹ کلاس کیرئیر کا آغاز کیا۔ 1978ء میں پاکستان کے خلاف فیصل آباد میں اپنے ٹسٹ کیرئیر کا آغاز کیا کپل دیو ایک تیز بالر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین بیٹسمین بھی تھے۔ وہ ایک ریکارڈ ساز آل راؤنڈر تھے۔ وہ دنیا کے واحد کھلاڑی ہیں جنہوں نے 400 وکٹیں لینے کے علاوہ پانچ ہزار رنز بھی بنائے ہیں۔ ٹسٹ کرکٹ میں 434 وکٹیں لینے کا عالمی اعزاز بھی کپل دیو کے پاس ہے۔ 1983ء میں ویسٹ انڈیز کے خلاف احمد آباد میں 83/9 کی کارکردگی دکھائی۔ ان کی بالنگ میں زیادہ تیزی نہ تھی مگر گیند کو دونوں طرف گھماتے اور آؤٹ سوئنگ بالنگ کرواتے تھے۔ وہ بہترین کپتان بھی تھا۔ 1983ء میں بھارت نے کپل دیو کی قیادت میں عالمی کپ جیتا۔

ٹسٹ کیرئیر: 131 ٹسٹ' 184 اننگز' 15 مرتبہ ناٹ آؤٹ' 5248 رنز اوسط 31.05' 8 سنچریاں' 27 نصف سنچریاں' بہترین سکور 163' 64 کیچز' 27770 گیندیں' 12868 رنز دے کر 434 وکٹیں' اوسط 29.64' اننگ میں 5 وکٹ 23 مرتبہ' میچ میں 10 وکٹ 2 مرتبہ' بہترین بالنگ 83/9۔

ون ڈے کیرئیر: 224 میچ' 197 اننگز' 39 مرتبہ ناٹ آؤٹ 3771 رنز' اوسط 23.86' بہترین سکور 175' ایک سنچری 14' نصف سنچریاں' 71 کیچز' 6909 رنز کے عوض 253 وکٹیں' اوسط 27.30' اننگ میں چار وکٹیں 4 مرتبہ بہترین بالنگ 43/4۔

☆ ☆ ☆

دل چسپ کھیل بغیر خرچ کے

محمد عمر سلیم

موسم بہار آیا

اس کھیل میں جتنے بچے دل چاہے کھیل سکتے ہیں۔ پہلے دو کپتان منتخب کریں اور باقی بچوں کو دونوں کپتان برابر برابر بانٹ کر دو ٹیمیں بنالیں پھر ٹاس کریں۔ جو ٹیم جیت جائے وہ زمین پر ایک لمبی لائن کھینچے اور دونوں ٹولیاں اس لائن کے دونوں طرف کھڑی ہو جائیں۔ جیتنے والی ٹیم کا کپتان گانا گانے کے انداز میں "موسم بہار آیا ہم (ہاری ہوئی ٹیم کے کسی بچے کا نام لے کر) علی کو لینے آئے ہیں"۔

اب دوسری ٹیم کا کپتان کہے گا "موسم بہار گزر جائے گا تم علی کو لے جا کر دیکھو"۔ اس کے بعد علی کو سب سے آگے سامنے کھڑا کر دے گا۔ باقی ٹیم کے سارے بچے لائن میں ایک دوسرے کی کمر پکڑ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ دوسری طرف دوسری ٹیم کا کپتان علی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچے گا اور اس کی ٹیم کے باقی سارے بچے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھینچیں گے۔ یہ ایک طرح کی رسہ کشی ہو گی اور دیکھا جائے گا کہ کون سی ٹیم دوسری ٹیم کو لائن سے کھینچ لیتی ہے۔ جو ٹیم دوسری کو کھینچ لے گی وہی جیت جائے گی۔

گول گرم

اس کھیل کو کھیلنے کے لیے کم از کم دو اور زیادہ سے زیادہ جتنے بچوں کو کھیلنا ہے وہ کھیل سکتے ہیں۔ کھیل کا آغاز دو ٹیمیں بنانے سے ہوتا ہے۔ کھیلنے کے خواہش مند تمام بچے اکٹھے ہو کر پہلے دو کپتان منتخب کرتے ہیں۔ پھر باقی بچے برابر برابر میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ اس تقسیم کے لیے کپتان اپنے پسند کے ساتھی بھی منتخب کر سکتے ہیں اور ٹاس کے ذریعے بھی۔

دو ٹیموں میں بٹ جانے کے بعد دونوں کے کپتان کسی سکے کی مدد سے ٹاس کرتے ہیں۔ جس کی باری آتی ہے وہ کھیل کا آغاز کرتا ہے۔

اس کھیل کے لیے سب سے پہلے تقریباً 20 فٹ کے فاصلے سے دو لائنیں کھینچی جاتی ہیں اور چاک یا پتھر کی نوک کی مدد سے درمیان میں ایک دائرہ بنا دیا جاتا ہے۔

اس کے بعد ٹوٹے ہوئے گملوں میں سے یا چپٹے پتھروں میں سے ایسے چھ ٹکڑے منتخب کئے جاتے ہیں جن کو ایک دوسرے کے اوپر رکھا جا سکے۔ انہیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر دائرے کے درمیان میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس کو کہتے ہیں "گول گرم" جب یہ چھ ٹکڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت یہ گول گرم کہلاتا ہے۔

اب جیتی ہوئی ٹیم ایک ساتھی کو منتخب کرتی ہے جو کہ لائن پر کھڑا ہو کر بال کی مدد سے گول کے پتھروں کو گراتا ہے، یعنی گول توڑتا ہے۔ اس لائن کے بالکل مقابل جو لائن ہوتی ہے وہاں پر دوسری ٹیم کا ایک ساتھی کھڑا ہوتا ہے جس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس بال کو کیچ کرے جس سے گول کو توڑا گیا ہے۔ یا گول نہیں ٹوٹ سکا تو بھی اگر وہ یہ بال کیچ کر لیتا ہے تو پہلی ٹیم آؤٹ ہو جاتی ہے۔ اگر کیچ نہیں کر سکتا تو پہلی ٹیم کے تمام ساتھی ادھر ادھر ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ اب دوسری ٹیم کے تمام ساتھیوں کا کام ہوتا ہے کہ وہ بال ایک دوسرے کو کیچ کرا کے پہلی ٹیم کے کسی ساتھی کو ماریں۔ اگر یہ بال کسی ساتھی کو بھی لگ جائے گی تو پہلی ٹیم آؤٹ ہو جائے گی۔ پہلی ٹیم کے ایک دو ساتھیوں کو ٹوٹے ہوئے گول کے پاس بھی رہنا چاہیے۔ اگر وہ دیکھیں کہ بال اتنی دور چلی گئی ہے کہ جہاں سے اگر کوئی مارے تو انہیں نہیں لگ سکتی تو جلدی سے آگے بڑھ کر گول کی تمام ٹھیکریوں کو ایک دوسرے پر رکھ دے اور زور سے چلائے "گول گرم"۔ اس طرح یہ پوری ٹیم جیت جائے گی اور کھیل ایک دفعہ پھر جیتی ہوئی ٹیم سے شروع ہو گا۔

اگر پورا گول نہ جڑا ہو اور بنانے والا دیکھے کہ اسے بال لگ جانے کا ڈر ہے تو وہ بھاگ جائے۔ بال دور جاتی دیکھ کر دوبارہ آ کر گول گرم کر دے۔

کارٹون کہانی
ملا پہنچ گئے آپریشن تھیٹر
شاہد ریاض شاہد
ایک دن ملا نصر الدین اپنے کسی عزیز کو دیکھنے ہسپتال گئے، وہاں بر آمدے میں ایک مریض ویل چیئر پر بیٹھا تھا۔ وہ واش روم جانا چاہتا تھا۔ اس نے ملا سے کہا......
بھائی صاحب تھوڑی دیر بعد میری ٹانگ کا آپریشن ہے مجھے واش روم جانا ہے ذرا امداد کر دیں۔
ملا نے فوراً حامی بھر لی اور اس مریض کو لے کر واش روم کے دروازے تک پہنچ گئے اور اس سے کہا......
بھائی بے فکر ہو کر جاؤ۔ فارغ ہو کر مجھے آواز دے دینا، میں باہر کھڑا ہوں واپس کرسی پر بیٹھا دوں گا
ملا جی مریض کو واش روم چھوڑ کر آئے تو انہوں نے ویل چیئر کی طرف مسکرا کر دیکھا اور دل میں سوچا......
ابھی تو مریض کو واپس آنے میں کچھ وقت لگے گا۔ کیوں نہ اس چیئر پر بیٹھ کر سیر کی جائے......
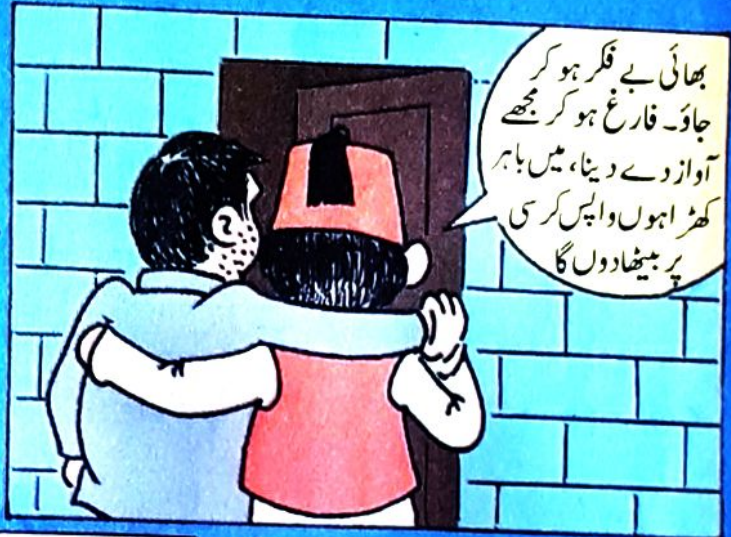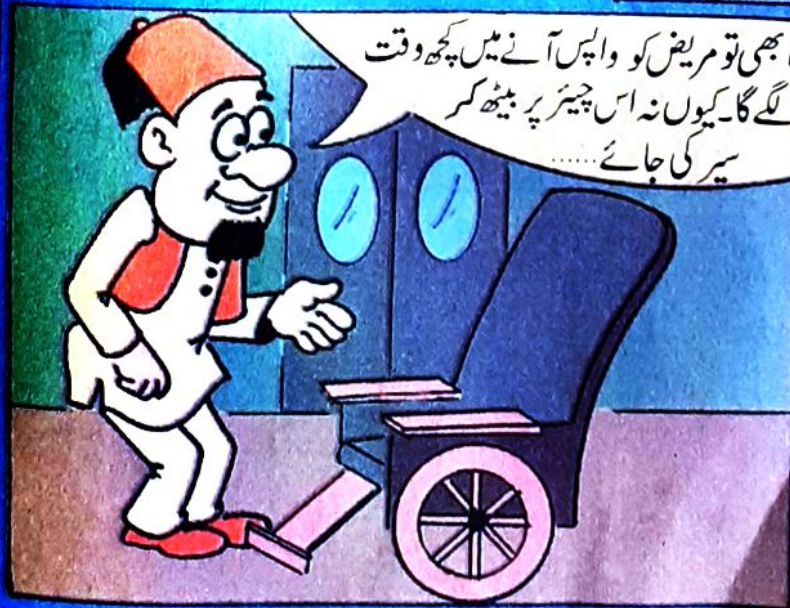
آخر کار ملا جی ویل چیئر پر بیٹھ کر سیر کرنے لگے اور زور زور سے نعرے لگانے لگے۔

ہاہ......ہاہ
واہ! واہ!
مزا آگیا
ہاں......ہاہ
ادھر دو وارڈ بوائز سے ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ باہر ویل چیئر پر بیٹھے مریض کو آپریشن تھیٹر میں لائیں۔ انہوں نے مریض کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔ ان کی نظر ملا پر پڑی اور ایک نے دوسرے سے کہا......
یار...... یہی وہ مریض ہے جس کا آپریشن ہے جلدی آؤ اسے اٹھائیں جلدی کرواور کام بھی تو کرنے ہیں۔
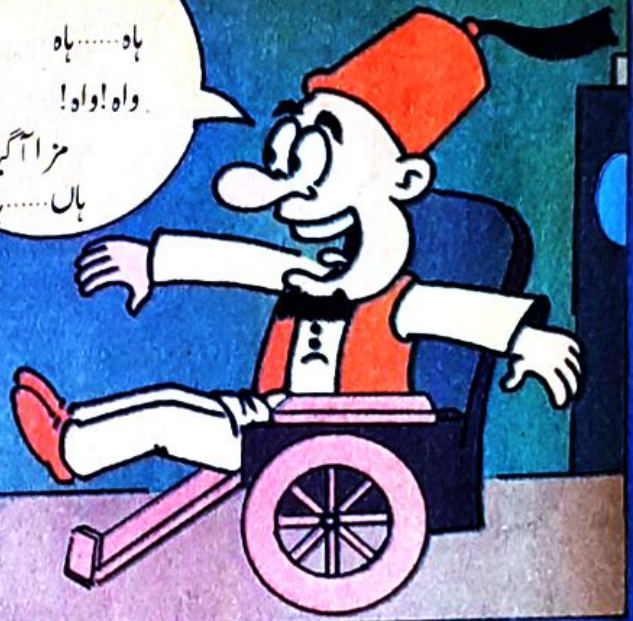
ادھر مریض کو ڈھونڈتے ہوئے دو وارڈ بوائے آئے اور ملا کو مریض سمجھ کر ویل چیئر سے اٹھالیا۔ ملا اپنے ساتھ یہ کارروائی دیکھ کر بوکھلا گئے اور سہم کر پوچھا......
کیوں بھائیو! مجھے ایسے کیوں اٹھا رہے ہو؟

ان لوگوں نے ملا کی ایک نہ سنی ایک وارڈ بوائے نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ انہیں آپریشن تھیٹر میں لے گئے جب کہ ملا مسلسل بولنے کے لیے زور لگاتے گئے
اوں......
اوں، آں
آں......

سائنسی تحقیق کے ادارے کے سربراہ پروفیسر شمل ممبا کار سے اتر کر دفتر کی عمارت کی طرف بڑھے تو صدر دروازہ خود بخود کھل گیا اور بڑی میٹھی آواز میں کسی نے کہا "پروفیسر ممبا خوش آمدید"۔

پروفیسر ممبا کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی لیکن بغیر کچھ کہے وہ آگے بڑھتے گئے۔ اسی آواز نے آہستہ آہستہ بتانا شروع کیا۔ "آپ کا کمرا کھول دیا گیا ہے۔ آپ کی ہدایت کے مطابق روشنی دھیمی رکھی گئی ہے اور ہیٹر کا درجہ حرارت بھی کم ہے"۔

پروفیسر پھر مسکرائے لیکن خاموش رہے۔ کمرے میں پہنچے تو ان کی پسند کی موسیقی بجنا شروع ہو گئی اور دیوار میں لگے ہوئے چھوٹے سے فوارے سے ان کی پسندیدہ خوش بو پھوٹ نکلی۔ پروفیسر نے کوٹ اتار کر ہینگر پر ٹانگا اور کام میں مصروف ہو گئے۔ پروفیسر کام کرتے کرتے ذرا تھک جاتے تو کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے تھے اور سامنے لگی ہوئی اسکرین پر حسین قدرتی مناظر دیکھنے لگتے۔

دفتر کا وقت ختم ہوا تو پروفیسر ممبا نے ہینگر پر سے کوٹ اتار کر پہنا اور گھر جانے کے لیے کمرے سے باہر آئے۔ ایک دم موسیقی بند ہو گئی، ہیٹر اور روشنی بجھ گئی۔ کمرے کا تالا بند ہو گیا اور پروفیسر صدر دروازے کے قریب پہنچے تو یہ کھل گیا اور وہی میٹھی آواز سنائی دی۔ "خدا حافظ پروفیسر ممبا۔ اپنا خیال رکھئے گا"۔

پروفیسر نے پہلے کی طرح کوئی جواب نہ دیا۔ لیکن ان کے چہرے پر پھر مسکراہٹ پھیل گئی۔ پچھلے چند ہفتوں سے یہ روزانہ کا معمول بن گیا تھا۔

کامون نامی یہ ساحلی ملک رقبہ میں بہت چھوٹا تھا اور آبادی بھی کم تھی لیکن سائنسی تحقیق کی وجہ سے اس نے بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ بڑے بڑے سائنس دان یہاں مختلف چیزوں کے بارے میں تحقیق کر رہے تھے۔

کئی سال کی محنت اور لگن کے بعد پروفیسر ممبا اور ان کے ساتھیوں نے کمپیوٹر سے متعلق ایک بہت اہم اور دلچسپ ایجاد کی تھی جس کی تفصیل وہ ایک پریس کانفرنس میں بتانا چاہتے تھے۔ یہ ایجاد کیا تھی اس کا کسی کو کان و کان پتا نہ تھا۔ صرف ان کے نائب اور قریبی ساتھی پروفیسر کوہل ان کے اس راز میں شریک تھے۔ اور پروفیسر ممبا اپنے عملے کو یہ بتا بھی چکے تھے کہ جب تک ان کا یہ کام پورا نہیں ہو جائے گا وہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔

اخباری نمائندے اور دوسرے مہمان کانفرنس ہال میں جمع تھے اور پروفیسر ممبا کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔ جو وقت مقرر تھا اس سے دس منٹ زیادہ ہو گئے تو سب لوگوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ کیوں کہ پروفیسر ممبا وقت کے بے حد پابند تھے۔ ان کے گھر فون کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ کافی دیر پہلے روانہ ہو چکے ہیں۔ ان کے موبائل کمپیوٹر فون (MCP) پر رابطہ کیا گیا تو پتا چلا کہ وہ بند ہے۔

کافی دیر انتظار کے بعد مہمان مایوس ہو کر واپس چلے گئے اور پھر یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ پروفیسر

ممبا کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ ادارے کے سارے لوگ اس بات سے سخت پریشان تھے اور پورے دفتر میں خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ صرف پروفیسر کوہل اکیلے ایسے تھے جنھوں نے نہ پریشانی ظاہر کی اور نہ خوف۔ الٹا وہ اپنے عملہ کے لوگوں سے یہی کہتے رہے کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے.... سب ٹھیک ہو جائے گا۔

افواہیں پھیلتی رہیں۔ کوئی کہتا تھا پروفیسر ممبا کو یقیناً کسی نے قتل کر دیا ہے۔ کسی کا خیال تھا کہ کوئی انہیں اغوا کر کے کسی دوسرے ملک لے گیا ہو گا اور کسی کی رائے تھی کہ پروفیسر ممبا اپنے ذاتی فائدہ یا حکومت سے اختلاف کی وجہ سے کسی اور ملک بھاگ گئے ہیں تاکہ اپنے ادارے کے راز اس ملک کے ہاتھ بیچ سکیں۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔

دوسرے دن دفتر میں سب لوگ افسردہ تھے اور ادھر پروفیسر ممبا کے خاندان والوں کو سخت پریشانی لاحق تھی۔ انہیں یقین تھا کہ پروفیسر ملک سے غداری کر کے کہیں نہیں جا سکتے لیکن یہ خیال ضرور تھا کہ پروفیسر کی جان کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پروفیسر کوہل دوسرے دن صبح بھی سب کو یہی تسلی دیتے رہے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

پولیس کے سربراہ تحقیقی ادارے کے دفتر آئے تو ان کی ملاقات پروفیسر کوہل سے بند کمرے میں ہوئی لیکن جب وہ واپس جانے لگے تو انہیں رخصت کرتے وقت پروفیسر کوہل نے ان سے یہ کہنے کے بجائے کہ وہ پروفیسر ممبا کو جلد سے جلد تلاش کریں، یہی کہا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔

دفتر والوں اور پروفیسر ممبا کے گھر والوں کو اب پروفیسر کوہل کی "سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا" کی یہ رٹ بہت بری لگنے لگی۔ وہ پروفیسر کوہل کے اطمینان پر حیران تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں یہ افواہ پھیلنا شروع ہو گئی کہ پروفیسر ممبا کے گم ہونے میں پروفیسر کوہل کا ہاتھ ہے۔ کیوں کہ وہ انہیں اپنے راستہ سے ہٹا کر خود سربراہ بننا چاہتے تھے۔

ادھر پولیس کے سربراہ اپنے محکمے کے افسروں کو ساتھ لے کر تیسری بار تحقیقی ادارے کے دفتر پہنچے اور دیر تک ان کی پروفیسر کوہل سے بات ہوتی رہی۔ پھر وہ لوگ دفتر کے کمرے سے اٹھ کر کمپیوٹر ہال میں گئے۔ کمپیوٹر ہال میں ایک کمرا پروفیسر کوہل کے لیے تھا جسے وہ خود ہی کھول سکتے تھے۔ کوئی اور اس میں نہیں جا سکتا تھا۔ البتہ کبھی کبھی پروفیسر ممبا اس کمپیوٹر روم میں ان کے ساتھ جاتے تھے۔

پولیس والے پروفیسر کوہل کے ساتھ ان کے کمپیوٹر روم میں گئے تو نکلنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ بڑی دیر ہوئی تو یہ افواہ پھیل گئی کہ پولیس نے پروفیسر کوہل کو گرفتار کر لیا ہے۔ کوئی کہتا تھا قتل کے الزام میں، کوئی بتاتا تھا اغوا کے الزام میں اور کسی کا کہنا تھا ملک کے خلاف سازش اور غداری کے الزام میں۔ ادھر یہ افواہیں پھیل رہی تھیں اور ادھر پروفیسر کوہل پولیس کے سربراہ کو یہ بتا رہے تھے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔

پولیس کے سربراہ نے پروفیسر کوہل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "پروفیسر کوہل! ہمارے لیے یہ کام کچھ مشکل نہیں ہے کہ ہم پروفیسر ممبا کا پتا لگا لیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہمیں کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کہاں ہو سکتے ہیں لیکن ہم یہی بہتر سمجھتے ہیں کہ آپ کی مدد سے آگے بڑھا جائے۔ ہم اور آپ مل کر کام کریں گے تو دونوں کے لیے آسانی ہو گی"۔

"یقیناً یقیناً میں بھی یہی سمجھتا ہوں کہ ہمارے ساتھ مل کر کام کرنے سے یہ گتھی بہت جلد اور بہت اچھی طرح سلجھ جائے گی۔ ہم ہر مدد کے لیے حاضر ہیں۔ کیوں کہ یہ نہ صرف ہمارا بلکہ ملک اور قوم کا کام ہے۔ اچھا آیئے اب میں آپ کو کمپیوٹر اسکرین پر یہ دکھاؤں کہ پروفیسر ممبا کہاں ہو سکتے ہیں"۔

یہ کہ کر پروفیسر کوہل نے کمپیوٹر کے "کی بورڈ" (KEY BOARD) پر انگلیاں چلانا شروع کیں لیکن کافی دیر

کی کوشش کے بعد بھی اسکرین پر کچھ دکھائی نہ دیا۔ اب تو پروفیسر کوہل بھی کچھ پریشان نظر آنے لگے۔ بہت دیر ہو گئی تو پولیس کے سربراہ نے بڑے روکھے لہجے میں کہا۔

"پروفیسر کوہل! یہ تو ایک طرح سے ہمارا وقت ہی ضائع ہوا۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ اتنی دیر میں تو ہم کافی کام کر چکے ہوتے۔ آپ خود سوچئے کہ اگر خدانخواستہ پروفیسر ممبا کو کچھ ہو گیا یا انہیں اغوا کرنے والے انہیں ملک سے باہر لے جانے میں کام یاب ہو گئے تو یہ بہت بڑا قومی نقصان تو ہو گا ہی لیکن ہماری بھی مصیبت آجائے گی"۔

پروفیسر کوہل نے پریشانی اور شرمندگی کے ملے جلے انداز میں کہا "میں شرمندہ بھی ہوں اور سخت پریشان و حیران بھی کہ یہ ہوا کیا ہے۔ کل اور آج صبح مجھے کمپیوٹر پر پروفیسر

ممبا کی طرف سے سگنل ملتے رہے ہیں۔ اس وقت پتا نہیں کیا ہو گیا ہے؟"۔

پولیس کے سربراہ نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "بہرحال اب میرے خیال میں یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اب ہم چلتے ہیں۔ کوئی خاص بات ہو تو مجھے موبائل فون پر بتا دیجئے گا' اجازت دیجئے"۔

یہ کہ کر پولیس کے سربراہ اور ان کے ساتھی افسر کمپیوٹر ہال سے باہر نکل گئے۔ پروفیسر کوہل نے پورے سسٹم کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن انہیں کوئی کام یابی نہیں ہوئی۔ ادھر پولیس والے اپنی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ راستہ میں ایک افسر نے سربراہ سے مخاطب ہو کر کہا۔

"سر! میرا خیال ہے یہ کمپیوٹر سگنل والی بات تو کچھ ڈرامہ ہی ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

سربراہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا "دراصل ابھی کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں ساری کہانی تو غلط نہیں ہو سکتی۔ تمہیں یاد ہو گا کہ کل شام تحقیقی ادارے کے ایک سو سنئیر سائنس دانوں نے بھی ذکر کیا تھا کہ کئی ہفتے سے پروفیسر ممبا کے لیے دفتر کا دروازہ خودبخود کھل جاتا تھا اور پھر ان کے کمرے کا تالا خود کھلتا' ہیٹر اور روشنی جل اٹھتی نیز ان کے آتے ہی موسیقی بھی خود بخود شروع ہو جاتی تھی"۔

پولیس افسر نے ہاں میں ہاں ملائی "جی سر! ایک نہیں بلکہ دو سائنس دانوں نے اس کی تصدیق کی تھی"۔

پولیس کے سربراہ نے کچھ سوچنا شروع کیا اور ایسے لگا جیسے وہ اونگھ رہے ہوں لیکن پھر اچانک انہوں نے پیچھے مڑ کر کہا "ہاں پھر بھی پروفیسر کوہل پر نظر رکھو بلکہ فوراً ان کی نگرانی کے لیے دو تین آدمی مقرر کر دو۔ ان کے بیانات کے بارے میں اب مجھے بھی کچھ شک ہونے لگا ہے۔ جو بات انہوں نے اتنے یقین کے ساتھ کہی تھی اسے وہ کمپیوٹر اسکرین پر آخر کیوں نہیں دکھا سکے؟"

کچھ دیر گزری تو پولیس کے سربراہ نے اپنے افسروں کو کمرے میں بلایا اور اس نے کہا "میرا خیال ہے کہ اب

وقت ضائع نہ کیا جائے اور پروفیسر کوہل کو حراست میں لے کر پوچھ گچھ شروع کر دی جائے۔ ان کا ٹیلی فون نہ آنے سے مجھے یقین آتا جا رہا ہے کہ وہ کمپیوٹر سگنل والی بات محض ڈرامہ تھی"۔

افسروں نے اپنے سربراہ کی بات سے اتفاق کیا اور یہ طے پایا کہ پروفیسر کوہل کے پاس جانے کی بجائے انہیں پولیس ہیڈ کوارٹرز بلایا جائے۔ جو افسر پروفیسر کوہل کو لینے گیا تھا وہ اکیلا واپس آیا اور اس نے بتایا کہ پروفیسر آنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ بہت مصروف ہیں اور کمپیوٹر روم کو ذرا سی دیر کے لیے بھی نہیں چھوڑ سکتے۔

پولیس سربراہ کو پروفیسر کی یہ بات بہت بری لگی لیکن وہ کچھ نہ بولے اور چند منٹ بعد اپنے جوانوں کو ساتھ لے کر تحقیقی ادارے کی طرف روانہ ہو گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ پروفیسر کوہل کہیں بھاگ نہ جائیں۔ راستے میں انہوں نے پروفیسر سے موبائل فون پر بات کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ فون بند ہے۔ دفتر پہنچ کر وہ سیدھے پروفیسر کوہل کے کمرے میں گئے تو کمرا خالی تھا۔ وہ تیزی سے کمپیوٹر ہال کی طرف دوڑے اور پروفیسر کوہل کے کمپیوٹر روم میں داخل ہونا چاہا لیکن وہ بند تھا۔ اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو انہیں اور بھی پریشانی ہوئی۔ ابھی پولیس سربراہ سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کارروائی کریں کہ سامنے باتھ روم کی طرف سے پروفیسر کوہل آتے دکھائی دیئے۔ انہیں دیکھ کر پولیس سربراہ کی جان میں جان آئی۔ پروفیسر کوہل نے کچھ کہے بغیر کمپیوٹر روم کھولا اور اندر داخل ہوئے۔ ابھی انہوں نے قدم اندر رکھے ہی تھے کہ وہ اچھل پڑے اور زور سے چیخے۔

"سگنل آنے لگا۔ دیکھیں دیکھیں سگنل آ رہے ہیں۔ وہ دیکھیں نقشہ بنتا جا رہا ہے۔ شمال مشرق میں چالیس ڈگری زاویہ' فاصلہ دس کلو میٹر۔ میں آپ کو پرنٹ آؤٹ دیتا ہوں۔ آپ لوگ روانہ ہوں۔ میں یہاں بیٹھتا ہوں اور موبائل فون پر آپ کو مزید اطلاع دیتا رہوں گا"۔

پولیس اور پروفیسر کوہل کے مشترکہ آپریشن کے ذریعے تھوڑی سی دیر میں پروفیسر ممبا کو آزاد کرا لیا گیا۔ جنہیں ایک غیر ملکی ایجنسی نے اغوا کیا تھا۔ ابھی وہ انہیں ملک سے باہر لے جانے کی کوشش میں مصروف تھے کہ پولیس نے انہیں قابو میں لے لیا۔ لیکن کسی وجہ سے یہ نہیں بتایا گیا کہ اس ایجنسی کا تعلق کس ملک سے تھا اور وہ پروفیسر ممبا کو اغوا کرنے میں کیوں کر کام یاب ہوئے۔

پروفیسر ممبا پولیس کی حفاظت میں تحقیقی ادارہ کی عمارت میں داخل ہوئے تو اسی میٹھی آواز نے انہیں خوش آمدید کہا اور دروازہ بھی خودبخود کھل گیا۔ پروفیسر سے ملاقات کے لیے صرف چند مشہور ہستیوں کو بلایا گیا تھا۔ کیوں کہ حکومت ابھی یہ بات عام نہیں کرنا چاہتی تھی کہ پروفیسر ممبا اور پروفیسر کوہل کی نئی ایجاد کیا ہے۔

پروفیسر ممبا اپنے مہمانوں کو بتا رہے تھے۔

"دیکھئے یہ میرے بائیں ہاتھ کی کلائی سے ذرا اوپر میری جلد کے اندر ایک ننھا سا کیپسول لگایا گیا ہے۔ مضبوط شیشہ کے اس کیپسول میں ایک سلی کون چپ ہے اور ایک مقناطیسی تار بھی۔ یہ ایک طرح سے میرا شناختی کارڈ ہے۔ جس کا رابطہ پروفیسر کوہل کے کمپیوٹر سے ہے جو ان کے کمپیوٹر روم میں رکھا ہے۔ دفتر کی عمارت اور خاص طور سے میرے کمرے کا بھی اس کمپیوٹر سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔ چناں چہ جب میں دفتر آتا ہوں تو میری کلائی میں پیوست "شناختی کارڈ" کے ذریعے کمپیوٹر مجھے پہچان لیتا ہے۔ پھر وہ صدر دروازہ کھولتا، میرا کمرا کھولتا، بجلی اور ہیٹر جلاتا، خوش بو چھڑکتا اور موسیقی بجاتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ کمپیوٹر اپنی کار گزاری مجھے سناتا رہتا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ میرے ہاتھ کے ہلنے سے میری کلائی کے کیپسول میں لگے ہوئے مقناطیسی تار میں ریڈ یائی فیلڈ کے ذریعے کرنٹ پیدا ہوتا ہے اور اس کرنٹ کی وجہ سے کیپسول میں لگے ہوئے سلی کون چپ سے ایک سگنل پیدا ہوتا ہے۔ یہ انوکھا سگنل کوہل کے کمپوٹر روم میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کو بتاتا رہتا ہے کہ میں کہاں ہوں۔ یعنی یہ کہ کمپیوٹر روم سے کس سمت میں ہوں، کتنے فاصلہ پر ہوں اور کس ماحول میں ہوں۔ یہ سگنل کمپیوٹر کے اسکرین پر چھوٹا سا نقشہ بنا دیتے ہیں۔

سلی کون چپ کا یہ تجربہ سب سے پہلے برطانیہ کی ریڈنگ یونی ورسٹی کے پروفیسر کیبن وارگ نے 1998ء میں کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بازو میں ایک چپ پیوست کرایا جو ان کے دفتر کے کمپوٹر کو سگنل دیتا تھا۔ یہ چپ ایک ہفتے تک ان کے بازو میں لگا رہا اور یہ صرف دفتر کی حدود میں کام کرتا تھا۔ لیکن اس تجربے نے اکیسویں صدی کے سائنس دانوں کے لیے تحقیق کا دروازہ کھول دیا۔ پروفیسر ممبا اور پروفیسر کوہل نے اپنی ایجاد کے لیے پروفیسر وارگ کے تجربے کو ہی بنیاد بنایا تھا۔

"آج 2007ء کا آخری دن ہے اور ابھی ہم اس کوشش میں مصروف ہیں کہ اس حفاظتی نظام کو بہتر بنایا جا سکے۔ ہم اس کے تجربے شروع کرنے ہی والے تھے۔ مجھے خوشی ہے کہ پہلا تجربہ خود مجھ پر ہو گیا اور بہت کام یاب رہا۔ ہمارا یہ نظام اب دنیا بھر کے بڑے بڑے دفتروں میں لگایا جائے گا۔ خیال ہے کہ ذمہ دار عہدے داروں کے جسم کے کسی بھی حصہ میں یہ شناختی کارڈ کیپسول لگا دیا جائے گا تاکہ دفتر کے کمپیوٹر ان کی شناخت کر سکیں۔ اس کے علاوہ پوری پوری عمارتوں کا کمپیوٹر سے رابطہ کر دیا جائے گا تاکہ ان ذمہ دار عہدے داروں کا پتا چلتا رہے کہ وہ کہاں ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو ان کی حفاظت میں آسانی ہو گی اور دوسری طرف ان کی نگرانی بھی ہو سکے گی کہ وہ کہاں آتے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ کمپیوٹر ان کے آرام اور آسانی کا بھی خیال رکھے گا اور دفتر کے ماحول کو ان کے لیے خوش گوار بنا دے گا"۔

اس لمبی تقریر کے بعد پروفیسر ممبا نے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھایا اور تین چار گھونٹ پانی پی کر پھر بولے "اور اب وہ بات سنئے جس کا پتا میرے اور سائنس کی وزارت اور پولیس کے سربراہ کے سوا کسی کو بھی نہیں۔ یہاں تک کہ پروفیسر کوہل کو بھی نہیں۔ وہ یہ کہ میرا اغوا بس ایک ڈرامہ تھا تاکہ پروفیسر کوہل کی کارکردگی اور کمپیوٹر کی صلاحیت کو پوری طرح آزمایا جا سکے۔ اور ہاں یہ بھی بتا دوں کہ جو کئی گھنٹے سگنل نہیں ملے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تجربہ کی خاطر میرا بایاں ہاتھ باندھ دیا گیا تھا۔ کیوں کہ اس میں حرکت نہیں ہوئی اس لیے مقناطیسی تار میں کرنٹ پیدا نہیں ہوا اور سگنل بند ہو گئے۔ پھر میرا ہاتھ کھولا گیا اور میں نے اسے ہلایا جلایا تو تار میں کرنٹ پیدا ہو گیا اور چپ سگنل دینے لگا"۔

پروفیسر کوہل نے زور دار قہقہ لگایا اور بولے "میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں سب ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن میری کوئی سنتا ہی نہیں تھا"۔

ہونہار مصور

موسم سرما کی صبح

جویریہ ندا' کراچی (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

ریحان سراج' راول پنڈی (دوسرا انعام: 75 روپے کی کتابیں)

رضوان علی شاہ' جھنگ صدر (تیسرا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

کرن اسلم' بہاول پور (چوتھا انعام 45 روپے کی کتابیں)

سدرہ مسعود کاموکی (پانچواں انعام: 40 روپے کی کتابیں)

مبشرہ اقبال' سرگودھا (چھٹا انعام: 35 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں: محمد امجد لاہور چھاؤنی۔ ساجد علی تبسم بہاول پور۔ فریحہ ظفران ڈیرہ غازی خان۔ سیدہ راحیلہ نذر ٹوبہ ٹیک سنگھ۔ محمد قاسم اعظم بھٹی گوجرانوالہ۔ صوفیہ اسلم بہاول پور۔ نادیہ تبسم بہاول پور۔ محمد عمار نعیم بھٹی خان پور۔ کوکب نعیم سید ہری پور۔ ماریہ سعید رحیم یار خان۔ سعدیہ فاطمہ فیصل آباد۔ جہانزیب سلطان حافظ آباد۔ انعم انجم لاہور۔ شاہین بیگ لاہور۔ سید انوار الحق جاذب ڈاگی غلام قادر خان۔ فیضان الحق اسلام آباد۔ عظمیٰ عندلیب اسلام پشاور۔ عقیل اکرم لاہور۔ محمد بلال الدین خان لودھی اسلام آباد۔ وسیم سلیم سیال کوٹ۔ سبطین حیدر کلووال۔ شمائلہ زہرہ ملتان۔ آمنہ حسنین لاہور۔ حسیب حسن ڈیرہ غازی خان۔ کرن اختر کراچی۔ سدرہ نعیم سرگودھا۔ ساجد علی تبسم بہاول پور۔ محمد عمار ملتان۔ ثانیہ اسلم گوجرہ۔ بینش لاہور۔ حسیب حسن ڈیرہ غازی خان۔ محمد عثمان کوئٹہ۔ حنا خان ڈیرہ غازی خان۔ فریحہ کنول گلگت۔ ساجد محمود سرگودھا۔ سارہ مجید رحیم یار خان۔ مزمل حسین اکمل روڈہ۔ سائرہ حفیظ اسلام آباد۔ عمران قیوم کراچی۔ بشریٰ حسن مرزا راول پنڈی۔ طاہر احمد ارائیں سانگھڑ۔

جنوری کا موضوع: چاند رات — آخری تاریخ 7 دسمبر

فروری کا موضوع: پتنگ بازی — آخری تاریخ 7 جنوری

ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی' 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام' عمر' کلاس اور پورا پتا لکھے اور اسکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔

دل چسپ اور ناقابلِ یقین

عبدالستار خان طاہر

مر کر زندہ ہو گئی

1973ء میں اٹلی کی تورین نامی ایک لڑکی بار بار دل کی حرکت بند ہو جانے سے مرجاتی۔ لیکن ڈاکٹر ہر مرتبہ بجلی کے جھٹکوں سے اس کے دل کی حرکت بحال کر دیتے اور وہ ہر بار مکمل طور پر صحت یاب ہو جاتی۔ اس کے دل کی حرکت پہلی بار بند ہونے کے بعد ڈاکٹروں نے اس کے ساتھ ایک خصوصی آلہ "کارڈیو مانیٹر" لگا دیا تھا۔ اس لیے جب کبھی اس کے دل کی حرکت بند ہوتی یہ آلہ الیکٹرک شاک کے ذریعے اس کے دل کی حرکت بحال کر دیتا۔ اس طرح یہ لڑکی ایک سو دس مرتبہ مر کر زندہ ہوئی۔

آبی ٹیلی وژن

آپ نے دیکھا ہو گا کہ ٹیلی وژن پر پانی کے نیچے کے مناظر کی تصویریں دکھائی جاتی ہیں۔ جس آلے سے ایسا ممکن ہوا ہے اسے آبی ٹیلی وژن کا نام دیا گیا۔ اس آلے کی ایجاد ایک سمندری حادثے کی وجہ سے ہوئی۔ جب 1951ء میں ایک برطانوی آب دوز الیفرے دریائے ٹیمز کے دہانے میں غرق ہو گئی تو برطانوی بحریہ نے ٹیلی وژن کیمرہ اور برقی روشنیاں ایک واٹر پروف کیمرے میں بند کیں اور یہ کیمرا جہاز کی مدد سے اس علاقے میں سمندر کے اندر اتار دیا جہاں الیفرے آب دوز ڈوبی تھی۔ کیمرے اور روشنیوں کو برقی رو جہاز کے جنریٹر سے فراہم کی جا رہی تھی۔ جہاز آہستہ آہستہ حرکت میں آیا اور اس کے ساتھ ہی ٹیلی وژن کیمرا بھی پانی کے نیچے والے مناظر کو جہاز میں نصب ٹیلی وژن اسکرین پر منتقل کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر کے بعد غرق شدہ آب دوز الیفرے کا سراغ مل گیا اور یوں زیر آب مناظر کی تصویریں نشر کرنے کا یہ پہلا تجربہ کام یاب ثابت ہوا۔ چناں چہ اس آلے کی کارکردگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے مسلسل تجربے ہوئے۔ اب کئی قسم کے جدید ترین آبی ٹیلی وژن تیار کیے جا چکے ہیں اور انہیں زیر آب تحقیق کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔

24 برس سے غار میں

ایک ہندوستانی سیاسی رہ نما کا ڈرائیور گزشتہ 24 برس سے دنیا سے الگ تھلگ ایک غار میں رہ رہا ہے۔ 83 سالہ چندن نائیر تقسیم ہند سے پہلے سیاسی رہنما "سبھاس چندر بوس" کا ڈرائیور تھا۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں سبھاس چندر بوس کے ہمراہ برما کی لڑائی میں حصہ لیا اور وہاں سے قید ہو کر 1974ء تک جنگی قیدی رہا۔ جب وہ قید سے

رہا ہو کر بھارت واپس آیا تو چندن نائیر جنگ کے دوران میں برما کے محاذ کی قتل و غارت سے ذہنی طور پر اتنا خوف زدہ تھا کہ اس نے اپنی بیوی بچوں کو چھوڑ کر ایک غار میں پناہ لے لی۔ جہاں اس کے ساتھ ایک کتا رہتا ہے اور اس کی گزر اوقات حکومت کی طرف سے مقرر کردہ پندرہ سو ماہانہ وظیفے پر ہوتی ہے۔ چندن نائیر غار میں رہ کر مذہبی کتابیں پڑھتا رہتا ہے اور عام لوگوں سے میل جول پسند نہیں کرتا۔

دیکھنا منع ہے

عام زبان میں غور سے دیکھنے کو گھورنا کہتے ہیں اور یہ ہمارے ہاں ایک عام عادت ہے۔ لیکن سنگاپور میں کسی کو گھورو تو وہ مرنے مارنے پر اتر آتا ہے۔ وہاں گھورنے پر 1996ء میں دنگا فساد اور قاتلانہ حملوں کے 77 اور 1997ء میں 55 واقعات ہوئے۔ وہاں نوجوانوں کے باقاعدہ گروہ بنے ہوئے ہیں۔ جن کا اصول ہے کہ جو تمہیں غور سے دیکھے اسے تم بھی گھورو۔ دراصل سنگاپور میں کسی کو گھورنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی کی جا رہی ہے اور وہاں اس حرکت کو ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا ہے۔

کچھ کھائے پیئے بغیر

ویت نام کی ایک لڑکی "تران ہونگ ہنگ" نے جس کی عمر 15 سال ہے، 5 مہینوں سے نہ کچھ کھایا نہ پیا۔ اسے بھوک اور پیاس محسوس ہی نہیں ہوتی۔ ویت نام کے لوگ بدھ مت کے پیروکار ہیں۔ اس لیے لوگوں نے یقین کے ساتھ کہنا شروع کر دیا کہ گوتم بدھ کی روح اس لڑکی میں آگئی ہے اور اس لڑکی کے روپ میں گوتم بدھ نے دوسرا جنم لیا ہے۔ کیوں کہ گوتم بدھ کے متعلق مشہور ہے کہ وہ کچھ کھاتا نہیں تھا اور نہ ہی پیتا تھا۔

یہ لڑکی 12 سال کی ہوئی تو اس نے صرف سبزیاں کھانی شروع کیں۔ 15 سال کی ہوئی تو اس کا بڑا بھائی مر گیا۔ لڑکی نے بھائی کے غم میں کھانا پینا چھوڑ دیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ 5 مہینے کچھ کھائے پیئے بغیر گزر گئے لیکن وہ ہر لحاظ سے تن درست و توانا تھی اور روزمرہ کے کام کاج کرتی تھی۔ گھر والوں نے اسے زبردستی کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کی لیکن اس نے یہ کوشش کام یاب نہیں ہونے دی۔ یہ واقعہ 1996ء کے ستمبر، اکتوبر کا ہے۔

سنترے کا چھلکا

نیاگرا آب شار دنیا کی چند ایک مشہور آب شاروں میں سے ہے۔ یہ امریکا میں واقع ہے۔ اس کی چوڑائی بہت زیادہ ہے۔ دریائے نیاگرا خاصی بلندی سے گرتا ہے اس کے نیچے پتھریلی زمین ہے۔ ذرا تصور میں لائیں کہ آپ یا آپ جیسا کوئی انسان دریا میں بہتا آتا ہے اور اس آب شار کے ساتھ نیچے گرتا ہے، تو کیا اس کی کوئی ہڈی پسلی سلامت رہ جائے گی؟ یقیناً ایک بھی نہیں۔ لیکن کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ 1901ء سے 1961ء تک سات انسان ایڈونچر کے طور پر اپنے آپ کو نیاگرا آب شار سے گرا چکے ہیں۔ ان میں ایک عورت تھی جو آب شار سے نیچے گر کر زندہ رہی۔ غور اس پر کریں کہ یہ ایڈونچر جو اصل میں خودکشی کی کوشش کے برابر تھا، "اینی ایڈی سن ٹیلر" نامی عورت نے 1901ء میں کیا تھا۔ اس نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ کول تار کے بڑے ڈرم کی طرح مضبوط لکڑی کا ڈرم بنوایا۔ اپنے

آپ کو اس میں بند کیا اور ڈرم دریا میں پھینک دیا گیا۔ بہتے بہتے ڈرم آب شار تک پہنچا اور نیچے گرا۔ اینی ایڈی سن ٹیلر کو چوٹیں تو ضرور آئیں لیکن شدید چوٹ ایک بھی نہیں تھی۔ حال آں کہ ڈرم مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ گیا تھا۔

اس کے بعد چھ آدمیوں نے اس طریقے سے اپنے آپ کو نیاگرا آب شار سے گرایا۔ ایک نے 1911ء میں دوسرے نے 1920ء میں' تیسرے نے 1928ء میں' چوتھے نے 1930ء میں' پانچویں نے 1951ء اور چھٹے نے 1961ء میں یہ مظاہرہ کیا تھا۔ ان میں سے چار گرے اور مر گئے اور دو زندہ رہے۔

جس نے 1911ء میں خودکشی یا ایڈونچر کی اس کوشش کا مظاہرہ کیا تھا' اس کا نام "بابی لیچ" تھا۔ اس نے اپنے آپ کو فولاد کی چادر سے بنے ہوئے ڈرم میں بند کر کے آب شار سے گرایا۔ اس کے جسم کی دو تین ہڈیاں ٹوٹ گئی تھیں لیکن وہ زندہ رہا اور اس کی یہ ہڈیاں جڑ کر ٹھیک ہو گئیں۔ اب خدا کی قدرت دیکھئے کہ اس مظاہرے کے نو سال بعد یعنی 1920ء میں وہ سڑک پر پیدل جا رہا تھا کہ اس کا پاؤں سنترے کے چھلکے پر آ کر پھسل گیا۔ اس طرح وہ گرا اور اس کے سر کو چوٹ آ گئی اور وہ مر گیا۔

ڈیڑھ لاکھ کا جوتا

بھلوان کے علاقے کے ایک زمین دار نے اپنے بیٹے کی شادی کی ہے۔ اس نے دلہن کے لیے ایک جوڑا زری جوتی سلوائی ہے جس پر ڈیڑھ لاکھ خرچ آیا ہے۔ جوتی میں خالص سونے کے تار لگائے گئے ہیں جن کا وزن 30 تولے ہے۔ اٹلی یا کسی دوسرے ملک کے کسی دولت مند آدمی کی بیوی' بہو یا بیٹی کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپوں کی جوتیاں تو ہو سکتی ہیں لیکن ایک ہی جوڑا ڈیڑھ لاکھ روپے کا شاید ہی کسی کے پاس ہو۔

دولت کی نمائش

اٹلی کے ایک شہر کیسرتا میں ایک شادی ہوئی۔ دلہن نے جو فرغل پہنا تھا اس کا وزن 218 کلو تھا اور اس کی چوڑائی تیرہ گز تھی۔ ان لوگوں کی شادیوں میں دلہنوں کو فرغل پہنایا جاتا ہے۔ اسے پہنا ہوا تو نہیں کہنا چاہیے کیوں کہ یہ اس طرح ہوتا ہے کہ فرغل کا ایک سرا دلہن کے کندے پر ہوتا ہے اور اس کی لمبائی دلہن کے قد سے دگنی یا تگنی ہوتی ہے۔ پیچھے والا سرا دو بچوں نے اٹھا رکھا ہوتا ہے۔ یہ سلک کے باریک کپڑے کا بنا ہوتا ہے اور اس کا وزن نہایت معمولی ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں بادشاہوں کے فرغل بھی اسی طرح کے ہوتے تھے۔

کیسرتا کے شہر کی 25 سالہ دلہن جس کا نام میریا روز ہے' کے باپ نے اس کے لیے 218 کلو وزنی فرغل بنوایا۔ ظاہر ہے دلہن اتنا وزنی فرغل نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ مشکل آسان کرنے کے لیے پہیوں والا ایک چبوترا بنایا گیا۔ دلہن اور اس کے باپ کو اس پر کھڑا کیا گیا اور فرغل دلہن کے کندوں پر ڈالا گیا اور باقی سارا فرغل اس چبوترے پر ڈھیر کر دیا گیا۔ یہ عجوبہ دیکھنے کے لیے سڑک پر تماشائیوں کا اتنا زیادہ ہجوم آ گیا کہ پولیس کو عام ٹریفک کا راستہ بدلنا پڑا۔

شہر کے بڑے پادری بشپ رمفلے نوگارو نے اس قدر وزنی اور اتنا زیادہ قیمتی فرغل دیکھ کر کہا " یہ دولت کا بہت ہی گھٹیا مظاہرہ ہے اور غریب طبقے پر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ ہم بہت ہی دولت مند ہیں"۔

امتحان

اعتزاز حکیم، لاہور چھاؤنی

ناصر ایک بنک میں معمولی کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی نہیں تھی کہ وہ اپنے کنبے کی مناسب طریقے سے ضروریات پوری کرے۔ اس کا ایک بیٹا تھا جو پیسے نہ ہونے کی وجہ سے کالج میں داخلہ نہ لے سکا تھا، ایک بیٹی تھی جس کی ابھی شادی کرنی تھی۔ اس کا بیٹا اس سے اکثر پوچھتا "کیا ساری خوشیاں امیروں کے لیے ہیں، ہمارے حصے میں صرف غریبی اور محرومیاں ہیں"۔

ناصر اپنے بیٹے کے سوال کا بھلا کیا جواب دیتا، صرف خون کے آنسو پی لیتا۔ ایک دن صبح بنک میں نہایت ہی خوش پوش آدمی آیا اور اس کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ ناصر نے کہا "جی فرمایئے" اس نے کہا "بنک جو بھی قرضے کی درخواست منظور کرتا ہے، وہ آپ ہی کے پاس سے ہو کے جاتی ہے۔ میری درخواست جو میں نے تین کروڑ روپے کے قرضے کے لیے دی تھی، وہ ابھی تک اٹکی ہوئی ہے۔ اگر آپ اس معاملے میں میرے ساتھ تعاون کریں تو میں آپ کو معقول رقم دوں گا لیکن اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو آپ کو اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میں پھر آؤں گا"۔

یہ کہ کر وہ آدمی چلا گیا۔ ناصر عجیب تذبذب میں پڑ گیا۔ رات کو وہ اسی سوچ میں گم گھر پہنچا۔ اس کی بیوی نے اس سے پوچھا "کیا کوئی پریشانی ہے؟" لیکن وہ ٹال گیا۔ ساری رات وہ سوچتا رہا، ایک طرف اس کے بچوں کا مستقبل تھا اور ایک طرف ایمان داری۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا اور مطمئن ہو کر سو گیا۔ دو دن بعد وہی شخص بنک میں آیا اور ناصر سے اس کا جواب پوچھا۔ ناصر نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "سنئے جناب، میں آپ کی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بہتر ہو گا آپ تشریف لے جائیں"۔ اس شخص نے کہا "اس کا انجام اچھا نہ ہو گا"۔

ناصر نے غصے میں کہا "جو کرنا ہے کر لیجئے، میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اللہ دیکھ رہا ہے اور مجھے ایک دن اس کی عدالت میں جانا ہے اور میں فخر سے وہاں جانا چاہتا ہوں، میں اپنے ایمان اور فرض سے غداری نہیں کروں گا"۔

وہ شخص پیر پٹختا ہوا چلا گیا۔ ناصر غصے سے ہانپ رہا تھا لیکن اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے امتحان میں سرخرو ہو گیا تھا۔ اس دن وہ گھر کافی خوش واپس آیا اور اپنے بیوی بچوں کو سارا ماجرا سنا دیا۔ اس کی بیوی اور بچے بہت خوش ہوئے کہ اس نے بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ اگلے دن جب وہ بنک پہنچا تو مینیجر نے ناصر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ وہاں ایک جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر وہ چونک گیا۔ ساتھ والی کرسی پر وہی شخص بیٹھا تھا جس نے اسے رشوت دینے کی کوشش کی تھی۔ مینیجر نے ناصر سے مخاطب ہو کر کہا "میں تمہیں اصل بات بتاتا ہوں۔ یہ لاہور زون کے ہیڈ ہیں۔ انہیں مین برانچ میں اکاؤنٹس کے لیے ایک ایمان دار آدمی کی ضرورت تھی، انہوں نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے تمہارا نام موزوں سمجھا۔ لیکن یہ تمہارا امتحان لینا چاہتے تھے اور تم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے ہو۔ تمہیں مبارک ہو تمہاری ترقی ہو گئی ہے اور تمہاری تنخواہ تین گنا بڑھ گئی ہے"۔

ناصر یہ باتیں سن کر اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو گیا اور بولا "اے الہٰی' بے شک تو واقعی صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے' یا الہٰی تیرا شکر ہے"۔ (پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)

اچھی باجی

شبنم گل' لاہور

"امی' امی' بچائیں مجھے" ثنا چیختی ہوئی آئی اور جلدی سے امی کے پیچھے چھپ گئی۔ ثنا کی امی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ سعدیہ دروازے میں کھڑی غصے سے گھور رہی تھی "امی آج تو نہیں چھوڑوں گی میں اسے!"

سعدیہ کی بات پر اس کی امی ثنا کا ہاتھ پکڑ کر بولیں "اب کیا کر دیا ہے ثنا نے؟"

"امی میں بیٹھک میں بیٹھی اپنی سہیلی آمنہ سے باتیں کر رہی تھی کہ محترمہ اندر چلی آئیں' آپ ذرا اس کا حلیہ تو دیکھیں' اور جب میں نے اسے وہاں سے جانے کو کہا تو ایسے ڈر کر بھاگی جیسے اس کے پیچھے بھوت ہو' آمنہ کا جوس بھی گرا دیا اور اس بے چاری کا اتنا اچھا لباس خراب ہو گیا!" "میں بھاگی تو نہیں تھی' وہ تو آپ نے اتنی زور سے چٹکی لی کہ میں بے اختیار اچھل پڑی اور آمنہ باجی کے کپڑے خراب ہو گئے" ثنا نے منہ بسورتے ہوئے کہا

"یہ بہت بری بات ہے' تم دونوں ہر وقت لڑتی جھگڑتی رہتی ہو' چلو مان لیا ثنا نے غلطی کی ہے' مگر تمہارا رویہ بھی کچھ اچھا نہیں ہے' دیکھو بیٹا! ثنا تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ تم اسے پیار سے بھی سمجھا سکتی ہو" امی جان ابھی اور بھی بہت کچھ کہتیں مگر سعدیہ زور سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ سعدیہ کی امی نے افسوس سے اپنی بڑی بیٹی کو دیکھا اور پھر پیار سے ثنا کو سمجھانے لگیں۔

ثنا سعدیہ سے تقریباً 6 سال چھوٹی تھی' جماعت چہارم میں پڑھتی تھی' ویسے تو وہ سمجھ دار بچی تھی مگر سعدیہ کے غصے سے بہت گھبرا جاتی اور اکثر بوکھلاہٹ میں کام مزید خراب ہو جاتا۔ لیکن سعدیہ یہ بات ماننے کو ہرگز تیار نہیں تھی کہ وہ ڈر کر یا بوکھلا کر ایسے کام کرتی ہے۔ بلکہ اس کا خیال تھا کہ وہ محض اسے تنگ کرنے کی خاطر ایسے کام کرتی ہے۔ اسی لیے ثنا کی ذرا سی غلطی پر ایسے ہی بیخ پا ہو جاتی۔ سعدیہ اپنے ابو کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اسی لیے کافی ضدی اور خودسر ہو گئی تھی۔ اپنی امی کے سمجھانے کا اسے بالکل اثر نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ وہ میٹرک کی طالبہ تھی' پڑھی لکھی سمجھدار لیکن ضدی بہت تھی۔ جس بات پر ایک مرتبہ اکڑ جاتی پھر ہار کبھی نہیں مانتی تھی۔ ایک دن سعدیہ اپنی دوست آمنہ کے گھر گئی۔ آمنہ کی بڑی باجی' لبنیٰ بھی وہاں موجود تھیں۔ سعدیہ کو ان سے باتیں کرنا بہت اچھا لگتا' وہ اتنی نرمی' پیار اور محبت سے باتیں کرتیں کہ سعدیہ کا دل چاہتا کہ بس وہ ان سے باتیں کرتی رہے۔ اس وقت بھی وہ مسکرا مسکرا کے سعدیہ سے باتیں کر رہی تھیں۔ جب آمنہ کی بہن عظمیٰ اندر آگئی اور آرام سے لبنیٰ باجی کی گود میں لیٹ گئی تو سعدیہ کو بہت کوفت ہوئی کیونکہ عظمیٰ کا حلیہ بہت عجیب سا ہو رہا تھا۔ گندے سے کپڑے۔اور الجھے ہوئے بال' لبنیٰ باجی بہت پیار سے عظمیٰ کو منانے لگیں کہ وہ چل کر کپڑے بدل لے اور کنگھی کر لے "دراصل عظمیٰ کو کل سے بخار ہے' جب ہی اتنی چڑچڑی ہو رہی ہے' ورنہ تو یہ فوراً کہنا مان لیتی ہے!" آمنہ نے عظمیٰ کے مسلسل انکار کرنے پر ذرا مسکرا کر سعدیہ سے کہا۔ آمنہ کی بات پر سعدیہ دل ہی دل میں ہنسی' "بے چاری کھسیا رہی ہے!"

اتنے میں لبنیٰ باجی عظمیٰ کو پیار سے منا کر باہر لے گئیں "ہماری باجی بہت اچھی ہیں' سعدیہ وہ ہم سب سے بہت محبت کرتی ہیں' میری تو سب سے اچھی دوست بھی ہیں!"

"کیا مطلب؟ تمہاری باجی تمہاری دوست ہیں" سعدیہ پہلے تو لبنیٰ باجی کی اتنی تعریف پر تھوڑا سا حسد کرنے لگی۔ پھر اسے آمنہ کی دوسری بات پر بہت حیرت ہوئی "ہاں بھئی میرے خیال سے تو بڑی بہنیں خدا کی نعمت ہوتی ہیں۔ میں

تو کسی پر بھی اتنا اعتماد نہیں کرتی جتنا اپنی باجی پر' میں تو اپنی ہر مشکل ان کو بتاتی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہوتا ہے کہ میری باجی میری مدد ضرور کریں گی' اور پھر پڑھائی میں بھی میری اتنی مدد کرتی ہیں جب ہی تو میں اتنی لائق ہوں" آمنہ نے آخری بات ذرا اترا کر کہی اور آمنہ کے لہجے کا فخر سعدیہ کو تھوڑا سا بے چین کر گیا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ سی ہو گئی۔ اسے خیال آیا جس طرح عظمیٰ نخرے کر رہی تھی اگر لبنیٰ باجی کی جگہ وہ ہوتی تو یقیناً اس نے ایک زوردار تھپڑ اسے لگا دینا تھا۔ گھر آکر بھی وہ کچھ پریشان سی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ابھی تو ثنا چھوٹی ہے مگر جب وہ بڑی ہو جائے گی تو کیا وہ بھی اتنے فخر سے اسے "اچھی باجی" کہہ سکے گی۔ وہ اپنی سوچوں میں گم تھی جب ثنا اس کے پاس چلی آئی "وہ' آپی' آپی مجھے اس کا مطلب بتا دیں ناں" ثنا نے ڈرتے ہوئے اس سے کہا عموماً ایسے موقعوں پر سعدیہ اسے جھڑک دیتی تھی کہ اسکول میں مس سے پوچھ لینا تھا' مگر آج اس نے بڑے پیار سے ثنا کو پاس بٹھا کر انگریزی کا سبق اچھی طرح یاد کرا دیا "شکریہ! آپی آپ میری بہت اچھی باجی ہیں!" سبق یاد ہونے پر ثنا نے پیار سے سعدیہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا اور پہلی بار سعدیہ کو عجیب سا اطمینان ہوا وہ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ اسے جلد ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور اس بات پر اطمینان بھی ہوا کہ وہ بھی ایک اچھی باجی بن سکتی ہے (دوسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)

لاکھوں میں ایک

نیلم دلنشیں صنم' شاہدرہ

سیانے کہا کرتے تھے کہ "ہمسائے ماں جائے" لیکن اب یہ بات پرانی ہو چکی۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے زمانے میں ایسا ہو مگر آج کل تو.... آپ سب کے پڑوسیوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ اپنے پڑوسیوں کے بارے میں تو میں سو فی صد یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ لاکھوں میں ایک ہیں۔ آیئے میں اپنے ہمسایوں کا تعارف کروا دوں۔

ہماری گلی میں کل پانچ گھر ہیں۔ ہمارے دائیں ہاتھ جو صاحب رہتے ہیں وہ صرف نام کے ہی راجا ہیں۔ خود کو حقیقی راجا ثابت کرنے کے لیے خوامخواہ دوسروں پر رعب جمانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی انہیں گھاس بھی نہیں ڈالتا۔ اس لیے بچارے راجا صاحب اپنے گھر والوں پر ہی حکم چلاتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ ہیں بہت بے سرے۔

ارے نہیں بھئی' آپ بالکل غلط سمجھے ہیں۔ وہ گلوکار تھوڑی ہیں' بس ذرا بولتے اونچا ہیں۔ صبح ہو یا دوپہر' شام ہو یا رات جب ان کا موڈ بگڑ جائے لڑکوں کو ایسی ایسی سناتے ہیں کہ کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے کو جی چاہتا ہے۔ مگر ہمیں کیا بھئی' یہ ان کا گھریلو معاملہ ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔

اب ذرا بائیں ہاتھ دیکھیے۔ ہمارے یہ ہمسائے بہت خوش اخلاق ہیں۔ صاحب نجانے کیا کرتے ہیں؟ یہ اس لیے کہہ رہی ہوں کہ انہیں کبھی کچھ کرتے دیکھا نہیں ہے۔ اس کے باوجود بڑے شاہانہ انداز میں گزر بسر ہو رہی ہے۔ بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ ان پر اللہ کا کچھ خاص کرم ہے۔ ان کی بیگم بڑی شاہ دل ہے۔ لیکن ہے ذرا وکھری ٹائپ کی۔

مجال ہے جو کسی کو کوئی چیز دے۔ محلے دار تو دور کی بات وہ تو فقیر کو بھی ایک پائی نہیں دیتیں۔ ایسی کھری کھری سناتی ہیں کہ فقیر بے چارہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتا ہے۔

ان کی دریا دلی کا ایک واقعہ سناتی جاؤں۔

میری بہن کے ہوم اکنامکس کے پریکٹیکل تھے۔ ہمارا چولہا چونکہ گیس والا تھا۔ اس لیے باجی نے ان سے کہا کہ اپنا چولہا دے دیں سہ پہر تک واپس کر دیں گے۔ محترمہ فوراً بولیں "چولہا تو نہیں مل سکتا"۔

"وہ کیوں خالہ جان؟" باجی ان کی صاف گوئی پر بڑی حیران ہوئیں۔

"میں نے ابھی روٹیاں پکانی ہیں" وہ بولیں۔

"آپ روٹیاں ہمارے چولہے پر پکالیں کوئی فرق نہیں پڑتا" باجی نے کہا۔

"نہیں بھئی میں آپ کو چولہا نہیں دے سکتی" انہوں نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔

مروت نام کی تو کوئی چیز ہے ہی نہیں ان میں۔ ان لوگوں نے گلی میں کمیٹی کا پائپ لگا رکھا ہے۔ ایک دن سامنے والے پلاٹ والے نے اس ٹونٹی سے اپنی بھینسوں کو پانی پلانا چاہا تو ان صاحب نے جھگڑا شروع کر دیا کہ ہم نے ٹونٹی اپنے لیے لگوائی ہے تم لوگوں کے لیے نہیں۔ اتنی سی بات پر وہ جنگ ہوئی کہ جنگ پلاسی بھی کیا حیثیت رکھتی ہو گی۔ بڑی جنگ جو قسم کی خاتون ہیں۔ محلے میں ہر ایک سے دو ایک بار ضرور جھگڑا کر چکی ہیں۔

جو حضرت ہمارے سامنے رہتے ہیں کہنے کو تو وہ بالکل بے ضرر سے انسان ہیں لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ اندر ہی اندر وہ بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ بڑے مطلبی ہیں۔ بھئی میں تو خدا لگتی کہوں گی ان کی بیگم بہت اچھی ہیں۔ محلے میں کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن ان کے بچے خدا کی پناہ۔

اف خدایا' اتنے بدتمیز اور ڈھیٹ بچے ہیں کہ کیا بتاؤں' جان بوجھ کر ہمارے ٹائیگر کو تنگ کرتے ہیں۔ منہ کے ساتھ بھوں بھوں کرتے ہیں اور ہمارا ٹائیگر پھر دو تین تین گھنٹے بھونکتا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اکثر ہماری بیل بجا کر بھاگ جاتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی شرافت ہے۔

چوتھے مکان والے ابھی کچھ دن پہلے یہاں منتقل ہوئے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ اتنے خوش اخلاق نہ ہوں۔

کیسے کیسے لگے ہمارے ہمسائے؟ بھئی آپ لوگ کیوں جلنے لگے ہیں۔ یہ تو بس اللہ کی دین ہے۔ ایسے پڑوسی تو قسمت والوں کو ہی ملتے ہیں۔ ہم نے جھوٹ تھوڑی کہا تھا کہ ہمارے پڑوسی لاکھوں میں ایک ہیں (تیسرا انعام: 80 روپے کی کتابیں)

اشارہ

سمیرا سلطان منہاس' اسلام آباد

یہ کافی سال پہلے کی بات ہے۔ جیسے ہی گرمیوں کی چھٹیاں ہوئیں' ماب دولت نے ماموں کے گھر جانے کی فرمائش کر دی' جہاں ہماری کزنز' جو ہماری طرح کافی شرارتی واقع ہوئی ہیں' ہمارے انتظار میں سراپا چشم بنی ہوئی تھیں۔ وہاں پہنچے تو پانچ شرارتوں سے لبریز دماغوں کے ملاپ سے ایک زبردست خیال نے جنم لیا۔ لیکن اس وقت ہمیں معلوم نہ تھا کہ اس کے زبردست ہونے نے کیا کیا گل کھلانے ہیں۔

خیر' اب ہم پانچوں اس انتظار میں تھے کہ ممانی جان ہمیں دکان سے سودا سلف لانے کو کہیں اور ہم اپنے منصوبے پر عمل درآمد کریں۔ دراصل ہمارے ماموں جان امریکا میں ہوتے تھے اور اس وقت ان کے بیٹے بھی بہت چھوٹے تھے۔ اس لیے ممانی جان چھوٹی چھوٹی چیزیں لانے کے لیے ہمیں ہی بھیجتی تھیں۔ آخرکار ممانی جان نے بلایا اور کہا کہ دکان سے دو کلو چینی لے آؤ۔ ہم تو تھے ہی اسی انتظار میں۔ ہم پانچوں نے کوٹ پہنے اور دکان کی جانب چل دیئے۔ تھاتو گرمیوں کا آغاز لیکن کوٹ اس منصوبے کا اہم جزو تھے۔ اس لیے پہننے پڑے۔ راستے میں جو لوگ ملے وہ سمجھے شاید ان کے دماغ گرمی کی وجہ سے "چل" گئے ہیں۔ خیر ہمیں کس کی پروا تھی۔ دکان پر پہنچے تو حسب معمول چینی' دال اور آٹا وغیرہ پیچھے شیلف پر رکھے ہوئے تھے جبکہ ٹافیوں اور ببل گم سے بھرے ہوئے ڈبے آگے پڑے تھے۔ ہم نے انکل سے دو کلو چینی کی فرمائش کی۔ جیسے ہی انہوں نے چینی ڈالنے کے لیے اپنا رخ موڑا' ہم پانچوں کے دس ہاتھ بڑی بے تکلفی سے ڈبوں کے اندر پہنچ گئے اور پھر آناً فاناً کوٹ کی جیبوں کے اندر چلے گئے۔ ہم نے سودا سلف لیا اور جلدی جلدی گھر کی راہ لی۔ یہاں میں آپ کو بتاتی چلوں کہ ہم اتنے بدتمیز بچے نہیں تھے کہ جانتے بوجھتے اس طرح کی گندی حرکت کرتے۔ بات صرف اتنی تھی کہ یہ ہمارے

لیے ایک مزے دار شرارت سے بڑھ کر کچھ نہ تھا جسے ہم نے ان دنوں بہت انجوائے کیا تھا۔

خیر واپس آئے، سودا آنٹی کو دیا اور پھر ہم پانچوں چھت پر گئے۔ جب جیبوں سے طرح طرح کی چیزیں نکلیں تو منہ میں اتنا پانی بھر آیا کہ بس کچھ نہ پوچھیں۔ پھر کیا تھا' ہم نے جلدی جلدی ان چیزوں پر ہاتھ صاف کیے۔ دو دن تو اس منصوبے سے کام چل گیا مگر کاٹھ کی ہانڈی تو بار بار نہیں چڑھتی۔ تیسرے دن جو ہمارا حال ہوا' وہ نہ ہی پوچھیں تو بہتر ہے۔

تیسرے دن جب ہم دکان پر گئے تو دکان دار صاحب چیزیں کم ہو جانے کی وجہ سے کافی پریشان نظر آئے۔ ہمیں بالکل اندازہ نہ تھا کہ ہماری اس حرکت کی وجہ سے کسی کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ خیر ہم نے اسی طرح کہا "انکل' دال دے دیں"۔ لیکن اس دفعہ بھول ہم سے یہ ہوئی کہ ہم یہ بتانا بھول گئے کہ کتنی مقدار میں۔ اب جب دکان دار صاحب پیچھے مڑے تو ہمارے ہاتھ حسب سابق بڑی بے تکلفی سے ڈبوں کے اندر جا پہنچے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جب وہ یہ پوچھنے کے لیے ہماری طرف مڑے کہ کتنی دال؟ تو ہمارے ہاتھ ڈبوں کے اندر دیکھ کر اس طرح حیران رہ گئے جیسے کوئی بچہ پہلی دفعہ ہاتھی کی سونڈ دیکھ کر حیران ہوتا ہے۔ اس وقت ہماری حالت یہ تھی کہ شرم کے مارے کان کی لوئیں' ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور چہروں نے جسم کے ساتھ نوے ڈگری کا زاویہ بنا لیا تھا اور اس پوزیشن کی وجہ سے ہم انکل کے بدلتے ہوئے تاثرات نہ دیکھ سکے۔ اب ہم انتظار کر رہے تھے کہ انکل ڈنڈا لائیں اور لگ جائیں ہمیں مارنے پیٹنے۔ لیکن جس چیز نے ہمیں حیران کر دیا وہ یہ کہ انکل کی شفقت بھری آواز ہمارے کانوں سے ٹکرائی۔ ہم ان کی باتیں آج تک نہیں بھولے۔ وہ کہ رہے تھے "بیٹا چوری کرنا تو بہت بری بات ہے۔ اس کی بہت بری سزا ملتی ہے جو آپ لوگوں کو اب شرمندگی کی صورت میں بھی مل رہی ہے۔ چلو آپ بتاؤ کیا چاہیے میں آپ کو ویسے ہی دے دیتا ہوں" لیکن ہمیں تو اس وقت دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ تھی۔ ہم سب نے انکل کو دل سے سوری کہا اور پھر جلدی سے گھر پہنچے۔ یقین کیجئے اس دن کے بعد آج تک کوئی ایسی شرارت نہ کی جس سے کسی کو کوئی نقصان پہنچے۔ کیونکہ "عقل مندوں" کے لیے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے

(چوتھا انعام: 70 روپے کی کتابیں)

نصیحت

سامیہ شازی' راول پنڈی

"حماد! یہ اپنی پنسل ذرا دینا۔ مجھے تھوڑا سا کام کرنا ہے"۔ جواد نے حماد سے کہا۔ "بھائی میں یہ ذرا لائن لگا لوں پھر دیتا ہوں" حماد نے جواب دیا۔ جواد غصے سے بولا "لائن کا بچہ! ادھر دو پنسل" یہ کہ کر جواد نے حماد سے پنسل چھیننے کی کوشش کی۔ جواب میں حماد نے بھی مزاحمت کی۔ اس پر جواد کو تاؤ آگیا اور اس نے حماد کے رخسار پر تھپڑ جڑ دیا اور پنسل چھین لی۔ حماد نے رونا شروع کر دیا۔ امی نے رونے دھونے کی آواز سنی تو فوراً کمرے میں داخل ہوئیں۔ "کیا ہوا؟" امی نے ناگواری سے پوچھا۔

"امی' بھائی نے مارا ہے!" حماد نے ہچکیاں لیتے ہوئے کہا۔ امی نے پوچھا "کیوں؟"

حماد کے کچھ کہنے سے پہلے ہی جواد بول اٹھا "امی' حماد نے مجھے جواب دیا تھا اس لیے مجھے غصہ آگیا"۔

"بری بات حماد بیٹا' بڑے بھائی کو جواب نہیں دیتے" امی نے پیار سے حماد کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"لیکن امی' بھائی نے مجھے خواہ مخواہ مارا ہے۔ میں کام کر رہا تھا۔ بھائی نے مجھ سے پنسل مانگی۔ میرا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا صرف لائن لگانی تھی۔ میں نے بھائی سے کہا کہ لائن لگا کر دیتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے تھپڑ مارا اور پنسل بھی چھین لی"۔ حماد نے سارا واقعہ امی کو بتایا۔

"کیوں جواد' یہی بات تھی؟" امی نے سوالیہ لہجے میں جواد سے پوچھا۔ جواب میں جواد نے کھسیا کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔ امی نے جواد کو نصیحت کی اور کمرے سے یہ کہتی ہوئی باہر چلی

گئیں "اب میں تم دونوں میں سے کسی کی آواز نہ سنوں"۔
امی کے جانے کے بعد جواد نے غصیلی نگاہوں سے حماد کو دیکھا۔ پھر دونوں اپنا اپنا ہوم ورک کرنے لگے۔
حماد اور جواد دو ہی بھائی تھے۔ حماد چھ سال کا اور جواد گیارہ سال کا۔ جواد کی طبیعت میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ بات بات پر اسے غصہ آجاتا۔ چھوٹے بھائی سے لڑنا اور اس کی پٹائی کر دینا' پھر امی کی ڈانٹ' روز کا معمول تھا۔ آج پھر وہی بات ہوئی لیکن شکر ہے دوبارہ کوئی جھگڑے والی بات نہ ہوئی ورنہ پھر وہی رونا دھونا شروع ہو جاتا۔ امی کی ڈانٹ اور نصیحت کا اثر صرف ایک دن رہا۔ دوسرے دن پھر کیرم بورڈ کھیلتے ہوئے دونوں بھائیوں کا جھگڑا ہو گیا۔ جواد بے ایمانی کر رہا تھا۔ حماد مسلسل اسے منع کر رہا تھا۔ جواد کو جو غصہ آیا تو اس نے حماد کی خوب خبر لی۔ امی نے آج کھڑکی سے سارا منظر دیکھ لیا تھا۔ جواد کی سخت طبیعت اور بلاوجہ لڑنے جھگڑنے کی عادت سے وہ سخت پریشان تھیں۔ وہ کمرے میں گئیں اور حماد کو چپ کرانے لگیں۔ اس کے بعد وہ جواد کا بازو سختی سے پکڑ کر اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ جواد دل میں ڈر رہا تھا کہ اب پٹائی ہوئی کہ ہوئی لیکن امی نے کمرے میں جواد کو کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ کر بالکل دوستانہ انداز میں اسے سمجھانے لگیں۔ "دیکھو بیٹا تم لوگوں کا روز روز کا جھگڑا مجھے ذرا پسند نہیں ہے۔ میں دیکھتی ہوں کہ تمہارا غصہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے اور تم اپنا غصہ کنٹرول نہیں کر سکتے"۔
"سوری امی' آئندہ ایسا نہیں ہو گا" جواد نے شرمسار لہجے میں کہا۔ "شاباش بیٹا مجھے تم سے یہی امید تھی"۔ امی نے جواد کے سر کو پیار سے سہلایا اور کہا' "بیٹا تم دونوں بھائی ایک دوسرے کے ساتھ پیار و محبت سے رہو تو کتنا اچھا ہے۔ کبھی چھوٹوں کی خوشیوں میں بھی شریک ہونا چاہیے اور ان کا کہا مان لینا چاہیے۔ جب آپ کسی چھوٹے سے پیار کریں گے تو چھوٹا بچہ بھی آپ کی عزت کرے گا' ہے نا؟" امی نے پوچھا۔
"جی" جواد نے مختصر جواب دیا۔
"اچھا اب جاؤ۔ میں امید رکھتی ہوں کہ آئندہ تم اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ پیار کا برتاؤ رکھو گے اور اسے مارو گے نہیں"
امی نے مسکرا کر کہا اور جواد سرہلاتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ اپنے کمرے میں گیا تو دیکھا کہ حماد کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے۔ جواد کو اپنے رویے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ حماد کے پاس گیا اور بولا "حماد ٹافی کھاؤ گے"۔
حماد نے جرات سے جواد کو دیکھا جو پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جواد نے جیب سے ٹافی نکال کر حماد کو دی۔ حماد نے آدھی ٹافی خود کھائی اور آدھی جواد کو دے دی۔ پھر دونوں بھائیوں نے مسکرا کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا اور مل کر کیرم بورڈ کی گیٹیاں سجانے لگے (پانچواں انعام: 60 روپے کی کتابیں)

عجیب اتفاق

بابر رؤف جھنگ صدر

یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک چھوٹا بھائی ہے۔ جس کا نام خرم ہے۔ ہماری ایک باجی ہیں جو مجھ سے چار سال بڑی ہیں۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئی تھیں۔ اس لیے ہم بھائیوں نے سوچا کہ کوئی شرارت کر کے باجی کو ڈرائیں۔
ایک رات ہم نے بستر کی سفید چادریں اپنے اردگرد لپٹیں اور منہ پر پاؤڈر مل لیا۔ اب ہم روحوں کی طرح نظر آرہے تھے اور آہستہ آہستہ باجی کے کمرے کی طرف چلنے لگے۔ جب ہم باجی کے کمرے کے قریب پہنچے تو اچانک ہمیں وہاں ایک اور روح نظر آئی جسے دیکھ کر ہماری تو جان ہی نکل گئی۔ ہم چیختے ہوئے واپس بھاگے تو اپنی ہی چادروں میں الجھ کر گر گئے۔ اتنے میں باجی کے چیخنے کی آواز آئی۔ بعد میں پتا چلا کہ اس رات اتفاق سے باجی نے بھی ہمیں روح بن کر ڈرانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ہم کئی دن تک بستر پر لیٹے چوٹوں سے کراہتے رہے۔ اور اپنی شرارت پر ملنے والی اس سزا سے محظوظ ہوتے رہے۔ (چھٹا انعام: 50 روپے کی کتابیں)

25
دسمبر
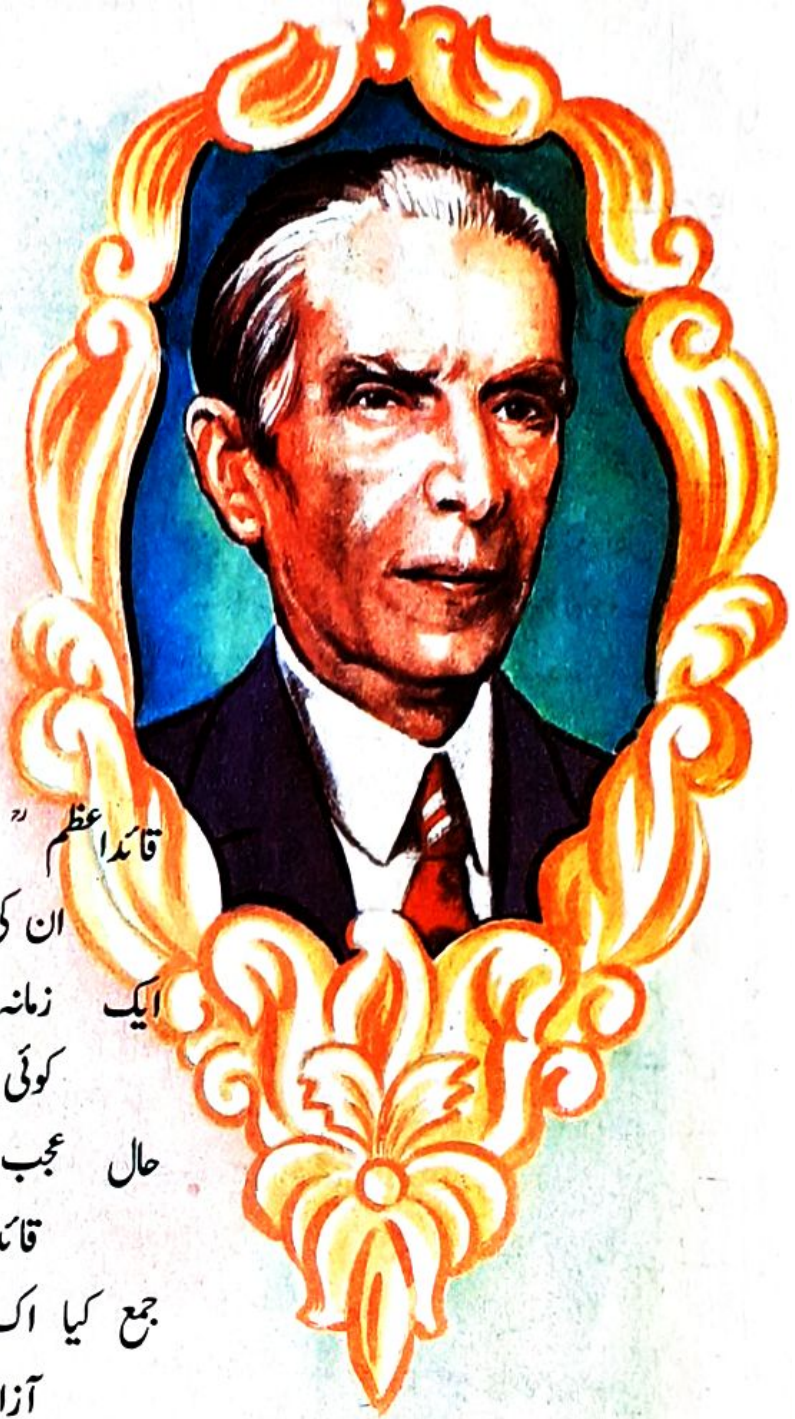
قائداعظمؒ سچ مچ تھے، اس دور کے قائداعظم
ان کی ہمت اور جرات کے دل سے قائل ہیں ہم

ایک زمانہ ایسا گزرا ہندوستان میں ہم پر
کوئی نہیں تھی منزل اپنی، کوئی نہیں تھا رہبر

حال عجب تھا اس امت کا بکھرا تھا شیرازہ
قائداعظمؒ نے خطرے کا ٹھیک کیا اندازہ

جمع کیا اک مرکز پر، سب بکھرے ہوئے لوگوں کو
آزادی کی راہ دکھائی سب مایوس دلوں کو

تھام لیا پھر سب نے مل کر مسلم لیگ کا پرچم
پاکستان کی خاطر سب نے جان لڑائی پیہم

آزادی کی منزل پر ہم پہنچے سارے مل کر
قائداعظم سچ مچ تھے اس قوم کے سچے رہبر

چاند ستارے کا پرچم ہے اپنا پیارا پرچم
چاند سے بڑھ کر روشن ہے یہ آنکھ کا تارا پرچم

قائد کی ہم یاد منائیں آؤ سارے مل کر
قائد کی پیدائش کا دن ہے پچیّس دسمبر

حفیظ الرحمان احسن

اس کارٹون کا اچھا سا عنوان تجویز کیجئے اور 500 روپے کی کتابیں لیجئے۔
عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 7 دسمبر 1998ء
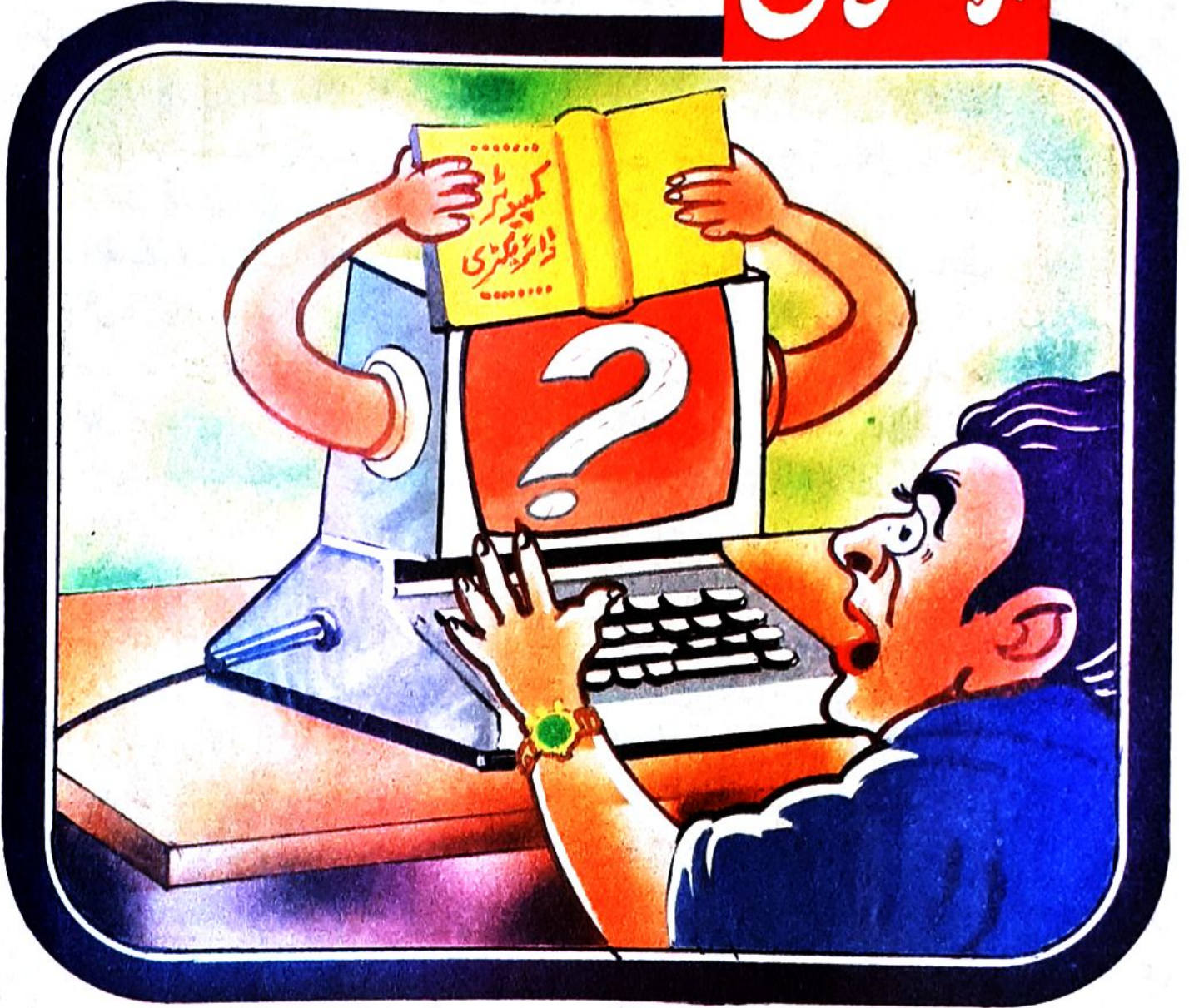
نومبر 1998ء کے بلاعنوان کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے۔ ان میں سے جج صاحبان کو مندرجہ ذیل چھ عنوان پسند آئے۔ جن ساتھیوں نے یہ عنوان تجویز کئے ان میں سے یہ چھ ساتھی بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے حق دار قرار پائے۔

- شازیہ کنول، میرپور خاص (تمہاری کشتی میرا کباڑا) پہلا انعام: 100 روپے کی کتابیں)
- جاوید اقبال راولپنڈی (ارے ہوش کرو یہ ٹی وی ہے اکھاڑہ نہیں دوسرا انعام: 95 روپے کی کتابیں)
- کرن اسلم بہاول پور (ہمیں کبھی نہ رنج ہوتا کاش کہ ٹی وی بند ہوتا۔ تیسرا انعام: 90 روپے کی کتابیں)
- ذی شان احمد میرپور خاص (پاؤں اندر کرتے ہو یا بدلوں چینل، چوتھا انعام: 80 روپے کی کتابیں)
- طوبیٰ صدیقی، اسلام آباد (باپ رے باپ ایسا لائیو (live)، پانچواں انعام: 75 روپے کی کتابیں)
- محمد علی محی الدین، کلر سیداں (لڑائی تمہاری، پٹائی ہماری، چھٹا انعام: 60 روپے کی کتابیں)

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

NO. CPL. 32 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES Price Rs. 15.00